ماھنامہ

تحقیقاتِ اسلامی

URDU MONTHLY MAGAZINE

May 2026

مُدیرمَسئول

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

مُدیرتحریر

مولانا محمد صغیر قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن دعوت الی الحق کیرانہ ضلع شاملی کا

علمی، دینی، تحقیقی واصلاحی ترجمان

ماہنامہ

تحقیقاتِ اسلامی

جلد (۱۳) بابت ماہ: ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۴۷ھ مطابق: مئی ۲۰۲۶ء شمارہ (۱۱)

مدیر مسئول

حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ کیرانہ وصدر انجمن دعوت الی الحق

مدیر تحریر

محمد صغیر قاسمی

09897855010

sagheerqasmi@gmail.com

ترسیل کے لیے رابطہ کریں: محمد معظم رحمانی قاسمی 09359602830

موبائل نمبر: 09359602830 ای میل: tahqiqateislami2011@gmail.com

شرح خریداری:

فی شمارہ: ۳۰/روپے سالانہ: ۳۰۰/روپے اعزازی: ۵۰۰۰/روپے

ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ہر طرح کی قانونی کارروائی کا حق صرف عدالتِ کیرانہ ہی کو ہوگا۔

خط وکتابت کا پتہ:

دفتر ماہنامہ "تحقیقاتِ اسلامی"

جامعۃ السعادۃ

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ کیرانہ ضلع شاملی (یوپی) انڈیا

Add: Office Tahqiqat-e-Islami
Jamiatus Sa'adah, Moh.Ibrahimpura
(Aal Kalan) Shamli Road, Kairana
Distt. Shamli (U.P.) India
A/c No. 3023002100004803
TAHQIQAT-E-ISLAMI
Punjab National Bank, Branch: Kairana

ناشر

تحقیقاتِ اسلامی

۲۴۱/آل خورد (ملتانیان) کیرانہ ضلع شاملی (یو۔پی) ۲۴۷۷۷۴

پرنٹر وپبلشر محمد عرفان نے جیوتی پرنٹنگ پریس منگلا مارکیٹ نزد مالویہ چوک، مظفرنگر سے طبع کرا کے دفتر تحقیقاتِ اسلامی ۲۴۱/آل خورد (ملتانیان) کیرانہ شاملی سے شائع کیا۔

آئینہ

صریر خامہ		
عید قرباں	محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی	(۳)
درس قرآن		
تفسیر سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃ	مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی	(۶)
مقالات ومضامین:		
فضائل ومسائل قربانی	مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی	(۱۲)
حج کے محاسن	مفتی ابوبکر الکوثری	(۱۶)
قربانی کا معنی...	مفتی رفیق احمد صاحب	(۲۰)
فلسفۂ قربانی اور ملحدین کے شکوک	مفتی محمد راشد ڈسکوی	(۲۹)
راہیں دوزخ کی، آرزو جنت کی	مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی	(۳۶)
تیری نسبت ابراہیمی ہے...	عمر فاروق ندوی فتحپوری	(۴۰)
ہیٹ ویو سے بچاؤ...	مولانا ابوبکر حنفی شیخوپوری	(۴۲)
فقہ وفتاوی	مفتی محمد ریحان گودھروی	(۴۴)
افسانہ		
قصہ چہار درویش	میر امن دہلوی	(۴۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید قرباں

محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

عید قرباں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اس عظیم قربانی کی یادگار ہے، جس میں ایک مشفق و مہربان باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اور صرف اللہ رب العزت کی محبت و اطاعت کے جذبے سے سرشار ہوکر، اپنے اکلوتے اور انتہائی پیارے لخت جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلادی، اللہ رب العزت کو نہ بیٹے کی گردن کٹانی تھی اور نہ باپ کے ہاتھوں کو بیٹے کے خون سے رنگین کرنا تھا۔ اللہ رب العزت تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمانا چاہتے تھے کہ دیکھیں عملی طور پر ابراہیم (علیہ السلام) میرے نام پر کتنی بڑی قربانی دے سکتے ہیں اور میرے احکامات کو کس حد تک بجالا کر میری خُلت کا حق ادا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام امتحان میں کامیاب رہے اور اپنے طور پر آپؑ نے اپنے ہاتھوں سے پیارے بیٹے کی گردن کاٹ دی، لیکن چونکہ مقصودِ باری بیٹے کا ذبح نہ تھا، اس لئے اللہ رب العزت نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ دنبہ بھیج دیا، جو آپ کی جگہ ذبح ہوا۔

باری تعالیٰ کو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی یہ قربانی، یہ ایثار و جذبہ اور یہ محبت و اطاعت اتنی پسند آئی کہ بعد والوں کے لئے اسے لازم قرار دے دیا۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی تاریخی واقعہ کی یاد میں ہر سال عید قرباں کے موقعہ پر جانوروں کی قربانی کر کے گویا اپنے اس جذبے کا اظہار اور اعلان کرتی ہے کہ وہ بھی اللہ رب العزت کے راستے میں اور اس کے احکامات کی اطاعت میں ہر طرح کی جانی و مالی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعتاً ہم اس دعوے اور اظہار میں سچے ہیں، اور جب وقت آتا ہے تو اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں؟

آیئے ذرا اپنے اندر جھانک کر، اپنے دل کو ٹٹول کر اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ اپنے اس دعوے میں ہم کتنے سچے ہیں!

اسلام ہم سے صرف سال میں ایک مرتبہ جانور کی قربانی ہی کا مطالبہ نہیں کرتا، دن میں پانچ وقت کی نمازیں بھی ہم پر فرض ہیں، ہم میں سے کتنے افراد ہیں جو اس کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے ۲۴ گھنٹے کے اوقات میں سے چند ساعتیں اللہ رب العزت کی یاد میں صرف کرتے ہوئے یکسوئی سے پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے ہیں؟

روزہ جو صرف صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور خواہش نفس کی تکمیل سے رُکے رہنے کا نام ہے، کیا ہمارے معاشرے کے تمام افراد اپنے نفس کی قربانی دیتے ہوئے اس فریضہ کو ادا کرتے ہیں؟ اموال کی زکوۃ اور

صدقات جو اسلام کی طرف سے عائد ہونے والا ایک اہم فریضہ اور معاشرتی ضرورت ہے، جس کے ذریعے ہم اپنے غریب و پریشان حال بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں، معاشرے کے دبے کچلے افراد کی مدد کر کے انہیں بھی آگے بڑھنے کا موقعہ فراہم کر سکتے ہیں، اور معاشرے میں عزت و وقار کے ساتھ جینے کا حق دے سکتے ہیں، ہم میں سے کتنے افراد ہیں جن کا دروازہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے کھلا رہتا ہے، اور جن کے مال و دولت سے یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کے گھر کا چولہا جلتا ہے، ان کے ننگے بدن کو کپڑا نصیب ہوتا ہے، سر چھپانے کے لئے مکان میسر ہوتا ہے، ہم نے کبھی سوچا کہ یہ بھی ایک قربانی ہے اور اس کا ثواب ہمیں اللہ ربّ العزت کے یہاں ملے گا۔

حج بھی فرائض اسلام میں سے ایک فریضہ ہے، جس کی ادائیگی ہر اس عاقل بالغ مسلمان پر لازم ہے، جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، جہاں جا کر ہمیں مساوات کا درس ملتا ہے، قلب و فکر کا تزکیہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ ربّ العزت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو اس فریضہ کی ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنی گاڑھی کمائی کا حصہ اس کے لئے قربان کرتے ہیں۔

آگے بڑھئے! صبح و شام اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں سے کتنے معاملات ہمیں پیش آتے ہیں، ان سے بات چیت میں، خرید و فروخت کرنے میں، عہد و پیمان کرنے میں، ہم اپنے اندر ایثار و قربانی کا کتنا جذبہ رکھتے ہیں؟ کیا کبھی اپنے نفس پر کنٹرول کرتے ہوئے کسی کی لغو اور بیہودہ باتوں کا جواب طاقت و قوت ہونے کے باوجود اس لئے نہیں دیا کہ اللہ ربّ العزت نے ایسے موقعہ پر سکوت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے؟ لین دین کرنے میں اپنا حق اس لئے چھوڑ دیا کہ نرمی اختیار کرنے کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے؟ کسی ضرورت مند کو قرض دے کر اس جذبے سے معاف کر دیا یا مزید مہلت دیدی کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی سکھایا ہے؟

سچ یہ ہے کہ عملی زندگی میں ہم قربانی کی اصل روح اور حقیقت سے دور ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ گھروں اور خاندانوں سے لے کر تنظیموں، جماعتوں اور اداروں تک انتشار اور بکھراؤ کا شکار ہیں، جب تک مومن اپنے پورے وجود کو، اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنی خواہشات اور دل چسپیوں کو، اپنے جذبات اور ارادوں کو مکمل طور پر احکامات الٰہی کے تابع نہیں کر دیتا، اس وقت تک قربانی کی روح کو نہیں حاصل کر سکتا۔

ہمیں چاہئے کہ ہر ایک کام کرتے وقت اپنے نفس اور خواہش کی نہیں بلکہ مولیٰ کی مرضی کا خیال رکھیں، اس کی نافرمانی سے مکمل طور پر بچیں، زبان پر کنٹرول رکھیں، پڑوسیوں اور اعزا و اقربا کا خیال رکھیں، لین دین میں اور معاملات طے کرنے میں نرمی کے پہلو کو غالب رکھیں، جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی ایسی تصویر بن جائیں کہ جس معاشرے، ماحول اور محلے سے ہمارا تعلق ہو، اس کے افراد ہمیں دیکھ کر ہی یہ محسوس کر لیں کہ یہ اللہ کے اطاعت شعار اور فرماں بردار بندے ہیں اور اپنے خدا کی مخلوق کے خیر خواہ و ہمدرد ہیں۔

اگر قربانی کے ذریعہ اطاعت شعاری، رحم دلی اور خیر خواہی کے جذبات نہیں ابھرتے اللہ اور اس کے رسول کے لیے اپنی جان و مال کی قربانی پیش کرنے کا حوصلہ نہیں پیدا ہوتا اور اخلاص وتقویٰ نصیب نہیں ہوتا تو ہمارے ہاتھوں سے ایک جانور کی قربانی تو ہوسکتی ہے لیکن اس کی حقیقت اور روح کو ہم نہیں پاسکتے۔ یہی مفہوم ہے ارشاد ربانی کا:

"لَنْ یَّنَالَ اللہَ لُحُوْمُھَا وَ لَا دِمَآؤُھَا وَ لٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ" (الحج:۳۷)

(اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔)

یعنی قربانی جو ایک عظیم عبادت ہے، اللہ کے پاس اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، نہ وہ مقصودِ قربانی ہے، بلکہ مقصودِ اصلی اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لینا اور حکم ربی کی بجا آوری، دلی اخلاص کے ساتھ ہے۔ اگر عبادات اخلاص ومحبت سے خالی ہیں تو صرف صورت اور ڈھانچہ ہیں، روح غائب ہے۔

اللہ ربّ العزت ہم سب کو اخلاص کی دولت سے مالا مال فرمائے اور اللہ ربّ العزت کی راہ میں ہر طرح کی قربانی دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

****

قربانی کے خلافِ عقل ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

از: حکیم الامّت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اگر کوئی کہے کہ قربانی عقل کے خلاف ہے کیونکہ (قربانی کے ذریعہ) خدا تعالیٰ خرچ کرا کر لیتے بھی نہیں، پھر کیا چیز مطلوب ہے، کیوں خرچ کرواتے ہیں؟ اس کا مقصد کیا ہے، اگر یہ کہو کہ ہم کو گوشت کھلانا منظور ہے، تو منیٰ اور مکہ معظّمہ میں ہزاروں جانور ذبح ہوتے ہیں، ان کا کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا، بالکل ضائع ہوتے ہیں اور یہ عقل کے خلاف ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جناب من! ہے تو فحش بات لیکن سمجھانے کیلئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شئی کا نہ آنا خلافِ عقل ہونے کی دلیل ہے، تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا، جس طریقہ سے ہوا ہے، وہ بھی عقل کے خلاف ہے، اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ تہ خانہ (اور کوٹھری) میں اس کی پرورش کی جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے، حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے، تو اس سے اچانک کہا جائے کہ آدمی اس طریقہ سے پیدا ہوتا ہے، تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا۔ اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے اور سنتے ہیں کہ اس طریقہ سے انسان پیدا ہوتا ہے، اس لئے ہم کو خلافِ عقل نہیں معلوم ہوتا، تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں، ہمارے تمام حالات ہی خلافِ عقل ہیں، ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے، ایسے ہی جیسے کسی نے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو ۲ / اور دو ۲ / کتنے ہوتے ہیں؟ کہا کہ چار روٹیاں، ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو اور باتیں بنالو، جب اتنی عقل ہے تو شریعت کے اسرار کہاں سے سمجھ میں آئیں۔ اسی طرح قربانی کی حکمت اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابلِ انکار کیسے ہوگئی؟ اسلئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت کو بیان کریں۔ (احکامِ قربانی صفحہ ۵۹-۶۰)

درس قرآن کریم

سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃ

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَآقَّۃُ ۝ مَا الْحَآقَّۃُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّۃُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَۃِ ۝

ترجمہ:

وہ ثابت ہو چکنے والی۔ کیا ہے وہ ثابت ہو چکنی والی، اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔ جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو۔ سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کر دیئے گئے اچھال کر۔

تفسیر وتشریح

زمانۂ نزول

زمانۂ نزول کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا تو مشکل ہے البتہ اس کے اسلوب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت میں ابھی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا عمود چونکہ وہی ہے جو سورۃ القلم کا ہے، صرف نہجِ استدلال میں فرق ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کا زمانۂ نزول القلم کے زمانۂ نزول کے قریب ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت سے یقینی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر فاروق (رض) کے ایمان لانے سے کافی عرصہ پہلے یہ سورۃ نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ مسند احمد میں حضرت عمر فاروق (رض) بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا۔ خیال تھا کہ راستے میں اگر آمنا سامنا ہو گیا تو میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پریشان کروں گا۔ لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے پہلے مسجد حرام میں داخل ہو کر نماز شروع کر چکے تھے۔ میں جب قریب پہنچا تو میں نے سنا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سورۃ الحاقہ پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریب کھڑا ہو کر سننے لگا۔ پھر قرآن کریم کے الفاظ کی دلآویزی اور اس کے اسلوب کے شان وشکوہ نے مجھے کان لگا کر سننے پر مجبور کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسا مسجع اور مقفع کلام دروبست کی ایسی

پختگی، الفاظ کا ایسا حُسنِ انتخاب، اشعار میں تو ممکن ہے، عام گفتگو میں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بلند پایہ شاعر ہے۔ ابھی یہ خیال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک آیت پڑھی جس کا معنی یہ تھا ''کہ یہ ایک رسول کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں۔'' میں نے فوراً دل میں سوچا کہ یقیناً یہ شخص کاہن ہے، اسی لیے دل کی باتیں جان لیتا ہے۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اگلی آیت پڑھی ''کہ یہ کسی کاہن کا قول نہیں، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو، یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔'' یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اتر گیا۔ اگرچہ اس کے بعد حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) دیر تک اسلام نہیں لائے، لیکن ایسا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جن واقعات نے آپ (رض) کے دل میں اسلام کی تخم ریزی کی ان میں یہ واقعہ بھی شامل ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب قریش کی مخالفت نے شرافت کی حدود پامال نہیں کی تھیں۔ کچھ نہ کچھ قرابتداری اور لحاظ داری کا پردہ حائل تھا۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گئی رات مسجد حرام میں نماز میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے اور اشرافِ قریش میں سے بعض لوگ چھپ چھپ کے سنتے تھے۔ (روح القرآن)

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی بالاتفاق مکیہ ہے، یعنی ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ ابن عباس و ابن زبیر (رضی اللہ عنہم) بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام طبرانی نے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فجر کی نماز میں سورۂ حاقہ اور اس کی مثل اور سورۃ پڑھا کرتے تھے۔ (حقانی)

ماقبل سے مناسبت:

اس سورۃ کی، سورۂ قلم سے مناسبت یہ ہے کہ انسان کی بدکرداری و کفر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے جو سزا نازل ہوتی ہے، جو دراصل اسی کے افعالِ بد کا نتیجہ یا ایک اثرِ غیر منفک ہوتا ہے، اس کی دو قسم ہیں: قسم اول: کو ابتلاء کہتے ہیں، جو محض اس کی سرزنش اور تنبیہ کے لیے ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے اپنے کردارِ بد سے باز آجائے اور اسی کو امتحان و آزمائش بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ قحط، وبا، بدامنی، باہمی نفاق و قتال و جدال، جبار بادشاہوں کا تسلط، زلزلہ، ژالہ باری، کثرت امراض، طوفان ہوا، طوفانِ آب وغیرہ یہ مصیبت ایک حیثیت سے قہر تو دوسری حیثیت سے (کہ یہ زاجر ہے اس کے سبب سے باز آئیں گے،) مہر بھی ہے، اس لیے اس میں بدوں کے ساتھ نیک بھی پس جاتے ہیں، تاکہ نیکوں کو تنبیہ ہو، جو امر معروف میں ان سے کوتاہی صادر ہوئی تھی، کچھ اس سستی کا خمیازہ یہ بھی تو اٹھائیں یا ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے یا رفع درجات اخرویہ کا سلسلہ ہو جائے اور ان کا امتحان بھی ہے کہ ایسی حالت میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔

اب اس کلیہ کو آپ اس کے سینکڑوں امثال پر مطابق کر لیجئے۔ طوفان نوح، سدوم وغیرہ بستیوں کی بربادی، بنی اسرائیل پر وبا اور غیر بادشاہوں کا تسلط جس میں سینکڑوں تہ تیغ ہو گئے۔ حضرت دانیال (علیہ السلام) جیسے اولوالعزم نبی بھی قیدیوں میں بابل پہنچے۔ انہیں نظائر کو قرآن مجید نے بار بار بندوں کو یاد دلایا ہے کہ ان پر پڑی تھی تم سن کر باز آجاؤ اور پہلی

کتابوں میں بھی ان ہولناک وقائع کو یاد دلایا ہے۔

قسم دوم: انتقام جو ابتلاء کے بعد بھی نہ سمجھے۔ اور اس سزا کو ''حاقہ'' کہتے ہیں جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی اور یہ انتقامِ الٰہی اخیر پر ہوتا ہے، جہاں نہ توبہ کی مہلت نہ استغفار کی فرصت ملتی ہے اور اس کے بعد دنیا سے رحلت ہو کر عالم برزخ کا قید خانہ ہوتا ہے یا قیامت کا تازیانہ۔ اس میں نیک لوگ شامل نہیں ہوتے ا،ن کو خدائے پاک بہرطور محفوظ ہی رکھتا ہے جو اس کی عدالت کا عین مقتضی ہے۔

سورۂ قلم میں کفار مکہ کو ابتلاء سے ڈرایا گیا تھا اور باغ والوں کا قصہ بھی یاد دلایا تھا: ''اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ''۔ جو ان کی گستاخی کی سزا تھی کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیوانہ کہتے تھے، جیسا کہ اصحاب الجنۃ کی بدنیتی کی سزا ان کو ملی تھی۔ مگر مکہ کے کفار جن کے دلوں پر خدا نے مہر کر دی تھی اس ابتلا کو جو سات برس کا قحط تھا اور بھی مصائب تھے، کب خاطر میں لانے والے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ ایسے ہی سخت دل رہے اور ڈھٹائی سے سخت عذاب آنے کے خواستگار ہوئے۔ اس لیے اس سورۂ مبارکہ میں ''حاقہ'' عذاب بیان فرماتا ہے، جو بیشتر قیامت میں ہوگا اور کبھی غیرتِ الٰہی دنیا میں بھی نازل کر دیتی ہے اور پہلی امتوں پر جو دنیا میں حاقہ نازل ہوا اس کی ان کے مسلمہ واقعات سے نظیر دیتا ہے۔ (حقانی)

اَلْحَآقَّةُ ۙ (وہ ثابت ہو چکنے والی) اَلْحَاقَّةُ... اس چیز کو کہتے ہیں جو خود حق اور ثابت ہو اور اسے بھی کہتے ہیں جو دوسری چیزوں کو حق ثابت کرنے والی ہو، ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا وقوع عقلاً و اخلاقاً لازم ہو، جو بالکل اٹل اور قطعی ہو، یہ ایک ہی لفظ جملہ کے قائم مقام ہے، یہ ایسا مبتداء ہے جسے خبر کی حاجت نہیں کیونکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی توجہ مبتداء پر مرکوز رکھی جائے۔ یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور یہ نام بجائے خود اپنے وجود پر دلیل ہے۔ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے اسے بہرحال واقع ہو کے رہنا ہے اور انسانی حالات کا مطالعہ اور اس کے نفسیات کی تشخیص یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ قیامت کا آنا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے ظہور اور اخلاقی نکتہ نگاہ سے ضروری ہے۔ اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ (روح القرآن)

چونکہ قیامت حق ہے، امر واقع ہے، اس کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے (اس لیے اس کو حاقۃ کہا گیا)۔ یا اس وجہ سے (حاقہ کہا گیا) کہ تمام امور کی حقیقت اس روز معلوم ہو جائے گی یا اس وجہ سے کہ اعمال کا بدلہ اس روز ضرور ملے گا۔ حَقَّ عَلَيْهِ الشَّيْءُ۔ وہ چیز اس پر لازم ہو گئی۔ اللہ نے فرمایا ہے: حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ۔ عذاب کی بات لازم ہو گئی (مؤخر الذکر دونوں صورتوں میں) قیامت کو الحاقۃ کہنا مجازاً ہوگا۔ (مظہری)

مَا اَلْحَآقَّةُ ۙ (کیا ہے وہ ثابت ہو چکنی والی۔) یہ اسلوبِ بیان قیامت کی عظمت، اہمیت اور وقوع کے لیے دلیلِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ اسلوبِ بیان اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب خطاب ایسے لوگوں سے ہو جو سر سے

پاؤں تک غفلت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور ہزار توجہ دلانے کے باوجود ہوش میں آنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ انہیں اس اسلوب سے باور کرایا جاتا ہے کہ تم قیامت کو مانو یا نہ مانو وہ تو آ کے رہنے والی چیز ہے، اس کا وقوع میں آنا حد درجہ یقینی ہے۔ اور پھر اس کی عظمت اور اس کے وقوع کے یقینی ہونے کو مزید نمایاں کرنے کے لیے فرمایا کہ کیا ہے وہ ہو کے رہنے والی؟۔ یعنی اس کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ (روح القرآن)

وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْحَآقَّةُ ۝ (اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔) استفہام انکاری ہے، کیا تم کو معلوم ہے، کسی چیز نے تم کو بتایا، تم کو کیا معلوم، کیسی ہولناک ہے قیامت۔ جملۂ استفہامیہ قیامت کی ہولنا کی کو ظاہر کر رہا ہے یعنی قیامت بڑی ہولناک چیز ہے۔ اس کی حقیقت تم کو معلوم نہیں، کوئی بھی اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ (مظہری) وہ ہو کے رہے گی۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہنے والا اپنی شخصیت کی پوری توانائی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے تمام جذبات سے کام لیتے ہوئے کسی ایسی بات کی عظمت کو انتہا درجے تک نمایاں کر دینا چاہتا ہے، سننے والے جس سے تکلیف دہ حد تک غفلت کا شکار ہوں اور یہ ہر زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے سننے والا اگر ہوش و خرد سے بالکل تہی دامن نہیں یا عصبیت نے اسے اندھا نہیں کر دیا تو وہ کہنے والے کے دل کے سوز سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور کبھی اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ تمھیں جس بات کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ تمھاری زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم جن عقلی پیمانوں سے اسے جاننے کی کوشش کر رہے ہو وہ ان پیمانوں سے ماورا چیز ہے۔ اقبال نے ایسے ہی احساسات سے معمور ہو کر یہ بات کہی ہے:

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

پیشِ نظر آیت کریمہ میں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تمھیں آج اس کی دہشت اور اس کی بے پناہی کا اندازہ نہیں۔ لیکن تمھیں کیا خبر کہ اس کے برپا ہو جانے کے بعد انسانوں پر کیا گزرے گی اور جو آج نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں وہ کس اندوہناک صورتحال سے دوچار ہوں گے۔ قرآن کریم نے یہ اسلوبِ کلام متعدد جگہ اختیار کیا ہے۔ قیامت ہی کے حوالے سے سورۃ القارعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ (روح القرآن)

اب اس کے بعد حاقہ (عذاب و سزا) کے چند نظائر بیان کئے جا رہے ہیں جو اگلی قوموں پر دنیا میں نازل ہوئے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌۢ بِٱلْقَارِعَةِ ۝ (جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو) ثمود: سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے اور عاد سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے۔ ''ٱلْقَارِعَةِ'' کھٹ کھٹا دینے والی ساعت۔ یعنی قیامت، جو ہر چیز کی توڑ پھوڑ، شکست و ریخت اور انتشار و پراگندگی کی وجہ سے لوگوں کے کانوں پر ضرب لگائے گی۔ (مظہری) مطلب یہ ہے کہ قوم ثمود و عاد نے اس آنے والی گھڑی کو جھٹلایا تھا جو تمام زمین، آسمان، چاند سورج، پہاڑوں اور

انسانوں کو کوٹ کر رکھ دے گی۔ اور سخت سے سخت مخلوق کو ریزہ ریزہ کر ڈالے گی۔ پھر دیکھ لو! دونوں کا انجام کیا ہوا۔ (عثمانی)

سابقہ تین آیات میں قیامت کے یقینی وقوع کا ذکر فرمایا اور اس کے آنے کو عقلاً و اخلاقاً لازمی قرار دیا۔ اب اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ قیامت کا آنا تو ایک حقیقت ہے، لیکن اسے تسلیم کرنا یا انکار کر دینا محض علمی مشغلہ نہیں بلکہ انسانوں کی تعمیر کردار اور باہمی معاملات کی بہتری اور دنیا کی مصلحت کے لیے اس کا آنا ازبس ضروری ہے۔ جو شخص اس کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت انسانی زندگی کی تباہی کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کا اقرار کرتا ہے وہ نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر چاہتا ہے بلکہ انسانوں کی بھلائی، خیر خواہی اور اجتماعی زندگی کی ہمواری کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس بنیادی حقیقت کو واضح کرنے اور قیامت کے عقیدے کو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر قرار دینے کے لیے پیش نظر آیات میں تاریخ سے استشہاد کیا گیا ہے۔ اور سب سے پہلے ثمود اور عاد کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ اس انجام کو صرف اس لیے پہنچے تھے کہ انھوں نے ''اَلْقَارِعَة'' کا انکار کیا تھا۔

''اَلْقَارِعَة'': قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھونکنے، کوٹنے، کھڑکھڑا دینے اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لیے یہ لفظ شاید اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ سب لوگوں کو مضطرب اور بے چین کرنے والی اور تمام آسمان وزمین کے اجسام کو منتشر کرنے والی ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی اچانک آکر دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتا اور نچنت ہونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ وہ اس طرح اچانک آدھمکے گی کہ پوری کائنات میں ایک ہلچل برپا کر دے گی۔ (روح القرآن)

قوم عاد وثمود کی ہلاکت عرب کے ملک میں ہوئی اور وہ ایک متواتر روایت تھی جس کا کوئی عرب انکار نہیں کرسکتا تھا۔ قوم ثمود عرب کے شمال وغرب کے حصے میں آباد تھی، جن کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے گھر اب تک یادگار ہیں اور ان سے پہلے قوم عاد نے قیامت کے وقوع کی تکذیب کی تھی، جو یمن میں رہتے تھے۔ ان لوگوں نے اگرچہ جھٹلایا تو رسولوں اور ان کی تمام باتوں کو بھی تھا، مگر قیامت کی تکذیب ایک ایسا فعلِ بد ہے جو انسان کو دلیر بنا کر تمام اصول سعادت سے روک دیتا ہے۔ اس لیے بالخصوص اس کا نام لیا گیا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ القارعہ سے مراد خاص قیامت نہیں بلکہ عموماً زواجر اور گناہوں سے روکنے والی اور دل کو ہلا دینے والی باتیں ہیں جو ان کے انبیاء علیہم السلام حضرت صالح وحضرت ہود (علیہ السلام) نے بیان فرمائیں تھیں۔ (حقانی)

فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ (سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کر دیئے گئے اچھال کر) گذشتہ آیت میں ثمود اور عاد کے بارے میں بیان فرمایا کہ انھوں نے قیامت کا انکار کیا تو پھر یہ نہ سمجھو کہ ان کے اس انکار کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ اس انکار کے نتیجے میں وہ ہلاکت کا شکار ہوئے۔ کیونکہ قیامت کا انکار صرف ایک واقعہ کا انکار نہیں بلکہ قوموں کے اخلاق اور ان کے مستقبل سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ قوم ثمود نے آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اپنی اصل زندگی سمجھ کر اپنی منزل قرار دے دیا۔ اور چونکہ انہیں آخرت میں کسی جوابدہی کا اندیشہ نہیں تھا اس لیے وہ سخت اخلاقی بگاڑ کا

شکار ہوئے۔ دنیا ہی کو اپنی منزل بنا کر دنیا طلبی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں لگ گئے۔ اس راستے میں اگر اخلاقی قدریں حائل ہوئیں تو انہیں پامال کر دیا گیا۔ انسانی رشتوں نے راستہ روکا تو ان کا خون بہایا گیا، کاروباری مصلحتوں نے اگر کسی چیز کی پابندی کا تقاضا کیا تو اسے فضول بات سمجھ کر رد کر دیا گیا، تو آخر اس قیامت کے انکار کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بگاڑ ان کی تباہی کا باعث بنا اور وہ ایک سخت حادثے سے تباہ کر دیئے گئے۔

الطَّاغِيَةِ.....طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں۔ طاغیہ کا معنی ہوگا وہ چیز جو اپنی حدود و قیود سے متجاوز ہو جائے۔ قوم ثمود بھی اللہ تعالیٰ کیخلاف طغیان میں مبتلاء ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جو آفت مسلط کی، اسے طاغیہ فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت: ۷۸ ر میں اس کو ''الرجفة'' یعنی زبردست زلزلہ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ ہود آیت: ۶۷ ر میں اس کے لیے ''الصيحة'' یعنی زور کے دھماکے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تینوں لفظ ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ اس سے مراد ایسی سخت آواز ہے جس کو انسان کا قلب و دماغ برداشت نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے ان پر ایسا زلزلہ آیا جس میں دھماکے تھے۔ اور ہولناک آوازیں تھیں جس سے ان کے دل شق ہو گئے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان پر بجلیاں بھی کوندی ہوں اور ان کی وجہ سے ان دھماکوں میں مزید اضافہ ہوا ہو۔ (روح القرآن)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ طاغیہ سے مراد غیر معمولی چیخ ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ صورت یہ ہوئی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک اتنی بلند چیخ ماری کہ سب مر کر رہ گئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آسمان کی طرف سے ایک ایسی چیخ پیدا ہوئی تھی جس میں ہر تڑک ہر کڑک اور ہر زمینی چیز کی آواز تھی، جس سے سینوں کے اندر دل پارہ پارہ ہو گئے۔ قصہ یوں ہوا کہ ثمود کی ہدایت کے لیے اللہ نے حضرت صالح علیہ السلام کو مامور فرمایا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے احکام الٰہی کی دعوت دی۔ لوگوں نے انکار کیا اور درخواست کی کہ (بطور معجزہ) ایک دس ماہ کی حاملہ اونٹنی پتھر کی چٹان سے برآمد کرو، اگر ایسا ہو گیا تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ صالح (علیہ السلام) نے دعا کی۔ آپ کی دعا سے ایک بڑی قدآور اونٹنی جس کی چوڑائی کا قطر ایک سو بیس ہاتھ تھا اور دس ماہ کی گابھن تھی، پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی اور فوراً ہی ایک بچہ بیاہ گئی جو اسی کی طرح تھا، لیکن لوگوں نے تب بھی آپ کی نبوت کا یقین نہیں کیا اور کہنے لگے: یہ جادو ہے۔ اللہ نے اس اونٹنی کو ان کے لیے عذاب بنا دیا۔ اس خطہ میں پانی کم تھا۔ ایک روز تمام پانی اونٹنی پی جاتی تھی اور ایک روز ان کیلئے چھوڑ دیتی تھی۔ گھاس کی بھی یہی صورت تھی۔ آخر ایک جماعت نے اونٹنی کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا اور سب سے بڑے بدبخت یعنی قدار بن سالف کو قتل پر مامور کیا۔ سب نے اونٹنی کو قتل کر دیا اور اللہ سے سرکشی کرنے میں حد سے بڑھ گئے اور حضرت صالح سے کہنے لگے: اگر تو سچا ہے تو جس عذاب کی تو ہم کو دھمکی دیتا ہے اس کو لے آ۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا: تین روز تک اپنے گھروں میں مزے اڑا لو۔ پہلے روز تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے۔ دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ، پھر چوتھے روز صبح کو تم پر عذاب آ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک چیخ نے ان ظالموں کو آ پکڑا اور گھروں میں زمین پر چپکے رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں بستی ہی نہ تھی۔ (مظہری)

مضامین ومقالات

فضائل ومسائل قربانی

حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

مسلمانوں کو اللہ تعالی کی طرف سے دوعیدیں عطا کی گئی ہیں، ان میں سے ایک عید الفطر ہے، جسے ابھی ماہ رمضان کے ختم پر انتہائی جوش وخروش کے ساتھ پوری امت مسلمہ نے منایا۔ اب عنقریب ماہ ذالحجہ کی دس تاریخ کو پوری امت دوسری عید ''عید الاضحیٰ'' منانے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ جس طرح عید الفطر کے موقعہ پر اولاً ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور پھر غریب مسلمانوں کو صدقۃ الفطر دینا اہم عبادت ہے، اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقعہ پر استطاعت رکھنے والے مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ فریضۂ حج ادا کرنا اور صاحب نصاب مسلمان پر قربانی کر کے اس کے ایک حصہ کو غریب مسلمانوں میں تقسیم کرنا اہم عبادت ہے۔ قربانی ایک اہم واجب اور اللہ تعالی کے نزدیک انتہائی پسندیدہ عبادت ہے، جس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا اور آج تک چلا آ رہا ہے، ہر مذہب وملت کا اس پر عمل رہا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ'' (الحج: ۳۴) (ہم نے ہر امت کے لئے قربانی مقرر کی تاکہ وہ چوپائیوں کے مخصوص جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائے۔)

قربانی کا عمل اگرچہ ہر امت میں جاری رہا ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں خصوصی اہمیت اختیار کر گیا، اسی وجہ سے اسے ''سنتِ ابراہیمی'' کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض خدا کی رضامندی کے لیے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کیلئے پیش کیا تھا۔ اسی عمل کی یاد میں ہر سال مسلمان قربانیاں کرتے ہیں۔

اس قربانی سے ایک اطاعت شعار مسلمان کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ رب کی فرمانبرداری اور اطاعت میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہے اور مال ومتاع کی محبت کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرے۔ نیز قربانی کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ قربانی کی طرح دیگر تمام عبادات میں مقصود رضاء الٰہی رہے، غیر کے لیے عبادت کا شائبہ تک دل میں نہ رہے۔ گویا مسلمان کی زندگی اس آیت کی عملی تفسیر بن جائے: ''اِنَّ صَلاَتِي وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔'' (الانعام: ۱۶۲) (میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ کی رضامندی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔)

قربانی کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہمیشگی فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ ''اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَۃِ عَشَرَ سِنِیْنَ یُضَحِّیْ'' (الترمذی) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا (اس قیام کے دوران) آپ قربانی کرتے رہے۔)

کئی احادیث میں قربانی کے فضائل وارد ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

عَنْ زَیْدِ ابْنِ اَرْقَمَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا ھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ قَالَ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامَ قَالُوْا فَمَا لَنَا فِیْھَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ حَسَنَۃٌ قَالُوْا فَالصُّوْفُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَۃٌ۔ (ابن ماجہ)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یارسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟ (یعنی قربانی کی حیثیت کیا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت (اور طریقہ) ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہمیں اس قربانی کے کرنے میں کیا ملے گا؟ فرمایا ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (پھر سوال کیا) یارسول اللہ! اون (کے بدلے میں کیا ملے گا) فرمایا: اون کے ہر بال کے بدلے میں نیکی ملے گی۔

ہر صاحبِ نصاب پر قربانی کرنا واجب ہے۔ اس بارے میں قرآن وسنت میں کئی دلائل موجود ہیں۔ چند یہ ہیں: ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ'' (الکوثر) (آپ اپنے رب کی نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔)

مشہور مفسر قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''قَالَ عِکْرَمَۃُ وَعَطَاءٌ وَقَتَادَۃُ فَصَلِّ لِرَبِّکَ صَلٰوۃُ الْعِیْدِ یَوْمَ النَّحْرِ وَنَحْرُ نُسُکِکَ فَعَلٰی ھٰذَا یَثْبُتُ بِہٖ وُجُوْبُ صَلٰوۃِ الْعِیْدِ وَ الْاُضْحِیَّۃِ'' (تفسیر مظھری) (حضرت عکرمہ، حضرت عطاء اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ'' میں ''فصل'' سے مراد ''عید کی نماز'' اور ''وانحر'' سے مراد ''قربانی'' ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نماز عید اور قربانی واجب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ''اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ کَانَ لَہٗ سَعَۃٌ وَلَمْ یُضَحِّ فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا'' (ابن ماجہ) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو قربانی کی وسعت حاصل ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ بھٹکے۔) وسعت کے باوجود قربانی نہ کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید ارشاد فرمائی اور وعید ترک واجب پر ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا قربانی واجب ہے۔

جس مرد وعورت میں قربانی کے ایام میں درج ذیل باتیں پائی جاتی ہوں ان پر قربانی واجب ہے:

(۱) مسلمان ہو۔ (۲) آزاد ہو۔ (۳) صاحب نصاب ہو۔ (۴) مقیم ہو، مسافر پر قربانی واجب نہیں۔ (۵) قربانی کا نصاب ہو۔ (قربانی واجب ہونے کا نصاب وہی ہے جو نصاب صدقۃ الفطر کے واجب ہونے کا ہے۔ یعنی جس مرد یا عورت کی ملکیت میں ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا نقدی مال یا تجارت کا سامان یا ضرورت سے زائد سامان میں سے کوئی ایک چیز یا ان پانچوں چیزوں یا بعض کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت

کے برابر ہوتو ایسے مرد وعورت پر قربانی کرنا واجب ہے۔)

قربانی کے دن متعین ہیں، انھی دنوں میں قربانی کرنا ضروری ہے۔اور وہ ہیں: ۱۰، ۱۱، ۱۲، ذوالحجہ۔

ارشاد باری ہے: ''لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ'' (الحج:۲۸) (تاکہ اپنے فوائد کیلئے آموجود ہوں اور ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپائیوں پر اللہ کا نام لیں۔)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''فَالْمَعْلُوْمَاتُ يَوْمُ النَّحْرِ وَيَوْمَانِ بَعْدَهُ'' (تفسیر ابن ابی حاتم الرازی ۶/ ۲۶۱) (ایام معلومات سے مراد یوم نحر (۱۰/ ذوالحجہ) اور اس کے بعد دو دن ہیں۔

''عَنْ سَلْمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَبَقِيَ فِيْ بَيْتِهٖ مِنْهُ شَيْءٌ'' (بخاری: ۲/ ۸۳۵) (حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں جو شخص قربانی کرے تو تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں قربانی کے گوشت میں سے کچھ نہ رہنا چاہئے۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے دن تین ہی ہیں، اس لئے کہ جب چوتھے دن قربانی کا بچا ہوا گوشت رکھنے کی اجازت نہیں تو پورا جانور ذبح کرنے کی اجازت کہاں سے ہوگی؟

فائدہ: تین دن کے بعد قربانی کا گوشت رکھنے کی ممانعت ابتدائے اسلام میں تھی، بعد میں اجازت دی گئی کہ اسے تین دن کے بعد بھی رکھا جا سکتا ہے۔(مستدرک حاکم ج4ص259) اس سے یہ نہ سمجھیں کہ ''جب تین کے بعد گوشت رکھنے کی اجازت مل گئی تو تین دن کے بعد بھی قربانی کی جاسکتی ہے'' اس لیے کہ گوشت تو پورے سال بھی رکھا جا سکتا ہے تو کیا قربانی کی اجازت بھی پورے سال ہوگی، ہرگز نہیں۔تین دن کے بعد قربانی کی اجازت نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ قربانی کے دن تین ہی ہیں۔(دیکھئے: مؤطا امام مالک ص497، کتاب الضحایا)

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ: اَلنَّحْرُ يَوْمَانِ بَعْدَ يَوْمِ النَّحْرِ وَاَفْضَلُهَا يَوْمُ النَّحْرِ'' (احکام القرآن للطحاوی: ۲/ ۲۰۵) (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن (دس ذوالحجہ) اور اس کے بعد کے دو دن ہیں، البتہ یوم النحر (دس ذوالحجہ) کو قربانی کرنا افضل ہے۔)

شہر میں مقیم حضرات کے لئے قربانی کا وقت نماز عید ادا کرنے کے بعد اور دیہات میں رہنے والوں کے لیے اگر وہاں عید کی نماز نہ ہوتی ہو، صبح صادق سے شروع ہو جاتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ سورج طلوع ہونے کے کی جائے۔

قربانی سے متعلق چند عمومی مسائل:

(۱) خصی جانور کی قربانی کرنا جائز بلکہ افضل ہے۔

(۲) ایسا لنگڑا جانور جو چلتے وقت پاؤں زمین پر بالکل نہ رکھ سکتا ہو اس کی قربانی جائز نہیں، البتہ اگر وہ چلنے میں اس پاؤں سے کچھ سہارا لیتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔

(۳) اگر جانور کے اکثر دانت ٹوٹے ہوئے ہوں کہ چارہ بھی نہ کھا سکتا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں، ہاں اگر چارہ کھا سکتا ہو تو قربانی جائز ہے۔

(۴) جس جانور کے پیدائشی طور پر ایک یا دونوں کان نہ ہوں یا کان کا تیسرا یا اس سے زیادہ حصہ کٹا یا چرا ہوا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔ ہاں اگر تیسرے سے کم حصہ کٹا ہوا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔

(۵) اگر جانور کی سینگ ٹوٹی ہو، لیکن جڑ سے نہ اکھڑی ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے اور اگر جڑ سے اکھڑ چکی ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

(۶) جانور کی دُم اگر تہائی سے کم کٹی ہوئی ہو تو قربانی جائز ہے اگر تہائی یا اس سے زائد کٹی ہوئی ہو تو قربانی جائز نہیں ہے۔

(۷) جانور اگر اندھا ہو یا کانا ہو یا ایک آنکھ کی تہائی یا اس سے زائد روشنی نہ ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں ہاں اگر روشنی تہائی سے کم جاتی رہے تو قربانی جائز ہے۔

(۸) اگر کوئی آدمی عقیقہ کی نیت سے قربانی کے جانور میں اپنا حصہ رکھ لے تو جائز ہے۔

(۹) ذبح کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ہو، لہٰذا مشرک، مجوسی، بت پرست، اور مرتد کا ذبیحہ حرام ہے۔ لوگوں میں یہ جو مشہور ہے کہ ولد الزنا کا ذبیحہ درست نہیں، یا عورت ذبح نہیں کر سکتی، اسی طرح رات میں ذبح کرنا درست نہیں ہے، یہ سب باتیں غلط ہیں۔ کوئی بھی مسلمان ذبح کر سکتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ بس ضروری ہے کہ شرعی طور پر ذبح کرنے کا طریقہ جانتا ہو۔

(۱۰) افضل یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کئے جائیں ایک حصہ اپنے گھر کے لیے، ایک حصہ رشتے داروں اور دوست واحباب کے لیے اور ایک حصہ فقراء ومساکین میں تقسیم کیا جائے، ہاں اگر خاندان بڑا ہو اور پورے گوشت کی گھر ہی میں ضرورت ہو تو سارا گوشت خود بھی رکھا جا سکتا ہے۔

(۱۱) اگر قربانی کے جانور میں کئی حضرات شریک ہوں تو گوشت وزن کر کے تقسیم کیا جائے اندازے سے تقسیم کرنا جائز نہیں۔

(۱۲) قربانی کا گوشت فروخت کرنا یا اجرت میں دینا جائز نہیں۔

(۱۳) کھال کو اپنے ذاتی استعمال میں لایا جا سکتا ہے، البتہ اس کو فروخت کر کے قیمت استعمال میں لانا جائز نہیں بلکہ فقراء کو دینا واجب ہے۔

(۱۴) کھال کی قیمت مسجد کی تعمیر میں نہیں لگائی جا سکتی اسی طرح کسی فلاحی ادارہ میں بھی اس کا خرچ کرنا درست نہیں، کیوں کہ اس میں ضروری ہے کہ اس کا فقراء ومساکین کو مالک بنا دیا جائے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ قربانی کی کھال کسی دینی مدرسہ اور جامعہ کے طلباء کو دی جائے کیوں کہ اس میں ان کی امداد کرنے کا ثواب بھی ہے اور علم دین کے احیاء کا سبب بھی۔

(۱۵) جاہلوں میں یہ جو مشہور ہے کہ بقر عید کے روز قربانی کرنے تک روزہ سے رہے، یہ محض بے اصل بات ہے۔ البتہ اپنی قربانی سے کھانا مستحب ہے، لیکن وہ روزہ نہیں ہے، نہ اس میں روزہ کی نیت سے خالی پیٹ رہنا درست ہے اور نہ ہی

اس میں روزہ کا ثواب ہے۔

حج کے محاسن

مفتی ابوبکر الکوثری

کسی حکم کا اصل حسن اور خوبی اس کا شریعتِ مطہرہ کی طرف سے مامور بہ ہونے میں مضمر ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ حکیم ذات ہے اور حکیم کبھی بھی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا جس میں ذرہ بھر قباحت اور برائی ہو۔ شریعت کے ہر حکم میں بے پناہ حکمتیں اور بے شمار خوبیاں پنہاں ہوتی ہیں جن تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی، لیکن بعض خوبیاں ایسی کھلی ہوئی اور ظاہر ہوتی ہیں کہ بعض دفعہ ایک عام انسان بھی ان کا اِدراک کر لیتا ہے۔ ہم ذیل کی سطور میں دین اسلام کے ایک اہم رکن حج کے بارے میں- بطور مشتے نمونہ خروارے- چند محاسن اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں:

1- حج کا معنی ہے: کسی چیز کا عزم کرنا۔ عزم کا تعلق دل کے ساتھ ہوتا ہے اور پورے بدن میں دل اشرف الاعضاء ہے، تو حج کا نام ''حج'' رکھنے میں ایک باریک سا اشارہ ہے کہ حج عبادات میں ایک بلند مقام رکھتا ہے، اس وجہ سے تو اس کو حج (قصد و عزم) کا نام دیا گیا، جس کا تعلق اعضاء انسان میں سب سے اہم عضو (قلب) کے ساتھ ہے۔ نیز عزم و ارادہ آدمی کو منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، تو حج بھی جس کا معنی ہی عزم ہے، انسان کو اپنے مقصود یعنی رضائے الٰہی کی طرف پہنچاتا ہے۔

2- اعمالِ حج کی عمومی کیفیت میدانِ حشر کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے کہ جس طرح لوگ اپنی خواب گاہوں یعنی قبروں سے اُٹھ کر محشر میں اس حالت میں جمع ہوں گے کہ وہ بے لباس، ننگے سر، ننگے پیر، اضطراب و پریشانی کی حالت میں ہوں گے، کچھ اسی طرح کی کیفیت حجاج کرام کی بھی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے بھی نہ سر پر ٹوپی ہوتی ہے نہ بدن پر کرتا، نہ خوشبو اور نا ہی زیب و زینت کا کوئی سامان، بلکہ ایک مجنونانہ انداز سے کرب اور بے چینی کی حالت میں مارے مارے پھر کر میدانِ عرفات میں جمع ہوتے ہیں۔

3- حج کے لیے ظاہر ہے سفر اختیار کرنا پڑتا ہے، اس لیے جب حاجی رختِ سفر باندھ کر نکلتا ہے تو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور محبین سے فراق کا خوگر بنتا ہے اور ایک دن دنیا سے تو بہر حال کوچ کرنا ہے، لہٰذا سفرِ حج کی وجہ سے جدائی اور فراق کے ساتھ اُنس حاصل ہوتا ہے، جس سے موت کے ذریعے واقع ہونے والی جدائی، حاجی کے لیے قابلِ تحمل ہو جاتی ہے، ورنہ سفرِ آخرت کی جان گداز جدائی پر طرفین (مسافر اور پس ماندگان) سے خوف، پریشانی اور بے صبری کے احوال اور جزع فزع کے دردناک مناظر سب کے سامنے ہیں۔

4- جب حاجی حج کے لیے عازمِ سفر ہوتا ہے تو وہ سفر کے متعلق ضروریات کو جمع کرنے لگتا ہے اور باتجربہ لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ایک ایک چیز کا خوب اہتمام کرتا ہے، حالانکہ یہ ایسا سفر ہے کہ جس میں اگر کسی چیز کی کمی محسوس ہو بھی جائے تو وہ اس کو حرم کی سرزمین میں پوری کرسکتا ہے، بلکہ وہاں تو ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے، نیز یہ ایسا سفر ہے کہ اس سے حاجی واپس بھی آجاتا ہے تو وسائل جمع کرنے کی اس تگ ودو میں اس کو یہ فکر بھی دامن گیر ہوجائے گی کہ جب اس عارضی چندروزہ سفر کے لیے اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے، تو سفرِ آخرت کے لیے تو اس سے کہیں زیادہ محنت اور تیاری کی ضرورت ہے، کیونکہ وہاں پر تو صرف وہ چیز دستیاب ہوگی جو آدمی دنیا سے لے کر جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ سفر انوکھا بھی ہے، اس لیے کہ اس سے واپس آنے کا بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

5- جب حاجی سفر کے لیے نکلتا ہے اور ان لوگوں کو راحت وآرام میں پاتا ہے جو اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ سہولت کا سامان لے کر گئے ہوتے ہیں، تو چونکہ حاجی کی ادائیں اور حج کا ماحول، آخرت کی بھرپور منظر کشی ہے، اس لیے حاجی کو یہ عبرت حاصل ہوجاتی ہے کہ کل محشر میں بھی وہ شخص زیادہ خوش وخرم ہوگا، جو ایمان کے بعد زیادہ سے زیادہ اعمال لے کر گیا ہوگا، یہ سوچ کر اس کے عملِ صالح بجالانے کے شوق اور ولولے میں اضافہ ہوگا۔

6- یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ حج کی برکت سے آدمی بڑی حد تک بخل اور کنجوسی جیسے مہلک روحانی امراض سے نجات پالیتا ہے، کیونکہ سفرِ حج میں دل چاہے یا نہ چاہے، اپنی صحت کو برقرار رکھنے اور موت سے بچنے کے لیے اس کو مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس کی برکت سے مال خرچ نہ کرنے کی بری عادت چھوٹ جاتی ہے۔

7- حج کے مبارک سفر کی بدولت مسلمان توکل علی اللہ کی صفت سے آراستہ ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ سفرِ حج میں ضرورت کی چیزیں ساتھ لے جانے کی مقدور بھر کوشش کرتا ہے اور یہ تو ممکن نہیں کہ ہر وہ چیز اپنے ساتھ لے کر جائے جس کی ضرورت اس کو پیش آتی ہے، اس لیے وہ زیادہ اہم چیزیں اُٹھا کر باقی کو چھوڑ دیتا ہے کہ چلو اللہ عافیت کا معاملہ فرمادے گا اور یہی توکل علی اللہ کی حقیقت ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''توکل یہ ہے کہ تمام اسبابِ ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور اختیار کرے اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے اور ان ظاہری اسباب پر فخر اور ناز نہ کرے، بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے۔ (معارف القرآن: ۲/ ۱۶۹)

8- حج کے محاسن میں سے ایک یہ ہے کہ سفرِ حج کی وجہ سے اس کے اعمال کی قیمت بڑھ جاتی ہے، مثلاً: حرمِ مکی میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ، اور حرمِ مدنی میں ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں وارد ہے کہ: ''جو شخص حج کے لیے پیدل جائے اور آئے، اس کے لیے ہر ہر قدم پر حرم کی نیکیوں میں سے سات سو نیکیاں لکھی جائیں گی، کسی نے عرض کیا کہ حرم کی نیکیوں کا کیا مطلب؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: حرم کی ہر نیکی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔'' (فضائلِ حج بحوالہ حاکم وصحیحہ)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''حرم میں ایک روزہ ایک لاکھ روزوں کا، اور ایک درہم صدقہ کرنا ایک لاکھ درہم کا ثواب رکھتا ہے اور اسی طرح ہر نیکی جو حرم میں کی جائے، غیر حرم کی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔'' (فضائلِ حج بحوالہ اتحاف) اس کے علاوہ سفرِ حج میں وہ اپنے دوست واحباب اور دیگر حجاج کی طرف سے پہنچائی گئی تکالیف پر صبر بھی کرتا ہے، جس پر اس کو اجر ملتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حج کے راستے میں تکلیفیں اُٹھانا، جہاد میں تکلیف اٹھانے کے برابر ہے۔'' (فضائل حج بحوالہ اتحاف)

9- سفرِ حج میں حاجی کافی مشقتیں برداشت کرتا ہے، سفر در سفر اور مسلسل بے خوابی کی وجہ سے اس کا بدن چور چور ہو جاتا ہے، لیکن جب حرم شریف پہنچ کر بیت اللہ کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے تو اس کی تمام تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ اندازہ لگائیں جب بیت اللہ کے دیکھنے کی یہ شان ہے تو خود خالقِ بیت اللہ کے دیدار کا کیا عالم ہوگا، سبحان اللہ! تو قیامت کے دن مسلمان جتنا بھی کٹھن اور پریشان کن حالات سے گزر جائے، مگر جب اس کی نجات کا فیصلہ ہو جائے گا اور دیدارِ الٰہی سے بہرہ ور ہوگا تو اس کی تمام پریشانیوں کا یوں خاتمہ ہو جائے گا، گویا اس نے کبھی مشقت نام کی کوئی چیز دیکھی ہی نہ تھی۔

10- جس طرح مرنے کے بعد میت سے سلے ہوئے کپڑے اُتار کر کفن پہنایا جاتا ہے اور زیب وزینت کی تمام چیزوں کو اس سے الگ کیا جاتا ہے، چنانچہ نہ اس کے ناخن اور مونچھیں کترے جاتے ہیں، نہ اس کے بالوں کو کنگھا کیا جاتا ہے اور نہ ہی تیل اور سرمہ لگایا جاتا ہے، بالکل اسی طرح حاجی احرام باندھتا ہے تو کُرتا اور سلے ہوئے کپڑے جو زندوں کا لباس ہے، دور کر کے دو کفن نما چادریں اوڑھ لیتا ہے اور آرائش کی تمام چیزوں سے اجتناب کرتا ہے، اس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ حاجی جب احرام باندھتا ہے تو گویا وہ مر جاتا ہے اور جب سفرِ حج پر روانہ ہوتا ہے تو گویا وہ عالمِ آخرت کی طرف چلا جاتا ہے۔

پھر جب حج سے فراغت کے بعد بخیر وعافیت گھر لوٹتا ہے تو گویا عالمِ آخرت میں اسی کی یہ تمنا پوری کر دی گئی ہے: ''یٰلَیۡتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُکَذِّبَ بِاٰیَاتِ رَبِّنَا وَ نَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ'' اور اس کو ایک بار پھر آخرت کی تیاری کا موقع دے دیا گیا ہے۔ حاجی اس مماثلت کو خاطر میں لا کر سابقہ گناہوں کے دوبارہ ارتکاب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اب خوب اہتمام کے ساتھ اعمال کی پابندی شروع کر کے عمل کا سچا اور وعدے کا پکا مسلمان بننے کی سعی کرتا ہے، تاکہ وہ وعیدِ خداوندی ''وَ لَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ'' کا مصداق نہ بن جائے۔

ایک بزرگ کے بارے میں قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں قبر نما ایک گڑھا کھود رکھا تھا، وہ گاہے گاہے اس میں اُتر کر اپنے آپ کو مردہ تصور کرتے اور یہ آرزو کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ زندگی عطا فرمائی تو میں ذرہ برابر اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا، اس کے بعد گڑھے سے نکل کر کہتے: اللہ نے میری تمنا پوری کر دی اور مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج کر تیاری کا ایک اور موقع فراہم کیا۔ اس طریقے کے اپنانے سے ان کو گناہوں سے بچنے کا ایک نیا شوق وحوصلہ مل جاتا۔

11- جس طرح نمازی نماز کے آخر میں سلام پھیر کر نماز سے نکل جاتا ہے، جس کے بعد اس کے لیے نماز کے منافی جائز کام حلال ہوجاتے ہیں، اسی طرح مُحرم، حلق یا قصر کے ذریعے احرام سے نکل جاتا ہے، جس کے بعد اس کے لیے حالت احرام میں ممنوع چیزیں جائز ہوجاتی ہیں، چنانچہ وہ سلے ہوئے کپڑوں، ٹوپی اور عام چپل کا استعمال شروع کرتا ہے اور اپنے جسم سے میل کچیل اور طبیعت کو ناگوار چیزیں دور کردیتا ہے، تو گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ حاجی سے فرماتے ہیں کہ تو نے اپنے بدن سے وہ ظاہری چیزیں جو تجھ کو ناگوار تھیں، میرے حکم کے مطابق دور کیں، تو میں اس کا زیادہ لائق ہوں کہ اس کے بدلے میں اپنی معافی کے ذریعے تجھ سے وہ مخفی کدورتیں یعنی معاصی دور کردوں جو مجھے ناگوار ہیں۔

12- حج کے محاسن میں سے ایک طوافِ صدر (الوداعی طواف) ہے، جس طرح ایک آدمی کسی کے ہاں مہمان بن کر کئی دن ٹھہرتا ہے اور جب لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے میزبان سے باقاعدہ اجازت لے کر رخصت ہوجاتا ہے، اسی طرح حاجی اللہ کا مہمان بن کر اللہ کے گھر میں کئی دن گزارتا ہے، جب واپسی کا ارادہ کرتا ہے تو عین انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ گھر کے مالک یعنی اللہ جل مجدہٗ سے اجازت مانگ کر واپس ہوجائے، جس کے لیے طوافِ صدر یعنی رخصتی کا طواف مشروع ہوا۔ پھر جس طرح میزبان واپسی کے وقت مہمان کا تحفے تحائف سے اعزاز واکرام کرتا ہے، خاص کر جب میزبان بادشاہِ وقت ہو اور مہمان کو بلایا بھی اسی نے ہو، بالکل اسی طرح اللہ جل شانہ بھی حاجی کو رخصت کرتے وقت قیمتی تحائف سے نوازتا ہے، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کو بخشتا ہے، کیونکہ وہ تو شہنشاہ (بادشاہوں کا بادشاہ ہے) اور دینے کے لیے اس کے پاس کروڑوں نعمتیں ہیں، جن میں سے سب سے بڑی نعمت، اللہ کی رضا اور مغفرت کا اعلان ہے۔

(ماخوذ: من محاسن الإسلام لأبي عبد الله محمد بن عبد الرحمٰن البخاري المتوفى ٥٤٦ھ بتغيير وتفصيل)

****

تحقیقاتِ اسلامی محض ایک ماہ نامہ یا رسالہ نہیں ہے، بلکہ ایک دینی، علمی، اصلاحی اور فکری تحریک ہے، جس کا مقصد مغربی تہذیب اور اس کے عریاں وفحش لٹریچر سے متأثر افراد کے رُخ کو موڑ کر قرآن وحدیث کی تعلیمات اور اسلامی تہذیب وتمدن کی جانب مائل کرنا ہے۔

قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ اس تحریک سے جڑیں، گھر گھر اسے پہنچانے میں ہمارا تعاون کریں اور لوگوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔ (ادارہ)

قربانی کا معنی و مفہوم اور مختصر تاریخ

مفتی رفیق احمد صاحب

قربانی کی اِبتداء

حلال جانور کو بہ نیتِ تقرب ذبح کرنے کی تاریخ، حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں: ہابیل و قابیل، کی قربانی سے ہی شروع ہوجاتی ہے، یہ سب سے پہلی قربانی تھی، حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کا اِرشاد ہے:

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ، اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ"۔(۱)

ترجمہ:۔"اور آپ اہلِ کتاب کو آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دیجیے، جب ان میں سے ہر ایک نے اللہ کے لیے کچھ نیاز پیش کی تو ان میں سے ایک کی نیاز مقبول ہوگئی، اور دُوسرے کی قبول نہیں کی گئی"۔

علامہ اِبن کثیر رحمہ اللہ نے اِس آیت کے تحت حضرت اِبن عباس رَضی اللہ عنہ سے رِوایت نقل کی ہے کہ ہابیل نے مینڈھے کی قربانی کی اور قابیل نے کھیت کی پیداوار میں سے کچھ غلہ صدقہ کر کے قربانی پیش کی، اُس زمانے کے دستور کے موافق آسمانی آگ نازل ہوئی اور ہابیل کے مینڈھے کو کھالیا، قابیل کی قربانی کو چھوڑ دِیا۔(۲)

اِس سے معلوم ہوا کہ قربانی کا عبادت ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہے اور اس کی حقیقت تقریباً ہر ملت میں رہی؛ البتہ اس کی خاص شان اور پہچان حضرت اِبراہیم و حضرت اِسماعیل علیہما السلام کے واقعہ سے ہوئی، اور اسی کی یادگار کے طور پر اُمتِ محمدیہ پر قربانی کو واجب قرار دیا گیا۔

قربانی کی حقیقت قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآنِ کریم میں تقریباً نصف درجن آیاتِ مبارکہ میں قربانی کی حقیقت، حکمت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔ سورۂ حج میں ہے:

۱-۲: وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ، فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ، كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۶)

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا

هَدٰکُمْ، وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ (۳۷)"(۳)

ترجمہ:۔"اور ہم نے تمہارے لیے قربانی کے اُونٹوں کو عبادتِ اِلٰہی کی نشانی اور یادگار مقرر کیا ہے، ان میں تمہارے لیے اور بھی فائدے ہیں، سوتم اُن کو نحر کرتے وقت قطار میں کھڑا کر کے اُن پر اللہ کا نام لیا کرو اور پھر جب وہ اپنے پہلو پر گر پڑیں تو اُن کے گوشت میں سے تم خود بھی کھانا چاہو تو کھاؤ اور فقیر کو بھی کھلاؤ، خواہ وہ صبر سے بیٹھنے والا ہو یا سوال کرتا پھرتا ہو، جس طرح ہم نے اِن جانوروں کی قربانی کا حال بیان کیا، اِسی طرح اُن کو تمہارا تابع دار بنایا؛ تاکہ تم شکر بجالاؤ!۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ان قربانیوں کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا؛ بلکہ اس کے پاس تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارے لیے اِس طرح مسخر کر دِیا ہے؛ تاکہ تم اس احسان پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو قربانی کی صحیح راہ بتائی، اور اے پیغمبر! مخلصین کو خوش خبری سنا دیجیے"۔

سورۂ حج ہی میں دوسرے مقام پر اسے شعائر اللہ میں سے قرار دیتے ہوئے اس کی عظمت بتائی گئی اور قربانی کی تعظیم کو دل میں پائے جانے والے تقویٰ خداوندی کا مظہر قرار دِیا ہے۔

۳:-"وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (۳۲)"۔(۴)

ترجمہ:"اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور یادگاروں کا پورا احترام قائم رَکھے تو ان شعائر کا یہ احترام دِلوں کی پرہیزگاری سے ہوا کرتا ہے"۔

سابق انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں قربانی کا تسلسل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک پہنچتا ہے، جس کا طریقہ یہ تھا کہ قربانی ذبح کی جاتی اور وقت کے نبی علیہ السلام دُعا مانگتے اور آسمان سے خاص کیفیت کی آگ اُترتی اور اُسے کھا جاتی، جسے قبولیت کی علامت سمجھا جاتا تھا، قرآنِ کریم میں ہے:

۴:-"اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ "۔(۵)

ترجمہ:۔"یہ لوگ ایسے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول کی اُس وقت تک تصدیق نہ کریں؛ جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے کہ اُس کو آگ کھا جائے"۔

قربانی کی تاریخ پہلے اِنسان ہی سے شروع ہوجاتی ہے:

۵:-"وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ م اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ "۔(۶)

ترجمہ:۔"اور آپ اہل کتاب کو آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دیجئے، جب اُن میں سے ہر ایک نے اللہ کے لیے کچھ نیاز پیش کی تو اُن میں سے ایک کی نیاز مقبول ہوگئی، اور دُوسرے کی قبول نہیں کی گئی"۔

۶:-"قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۶۲)"(۷)

آیت بالا کے تحت امام جصاص رَازی لکھتے ہیں:

"ونسکی: الاضحیة، لانها تسمی نسکاً، وکذلک کل ذبیحة علی وجه القرابة إلی اللہ تعالیٰ فهی نسک، قال اللہ تعالی: ففدیة من صیام وصدقة ونسک"۔(۸)

ترجمہ:۔"نسک" سے مراد قربانی ہے؛اس لیے کہ اُس کا نام "نسک" بھی ہے، اِسی طرح ہر وہ جانور جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کیا جائے وہ "نسک" کہلاتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ"۔(۹)

قربانی کے اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور انداز سے نماز کے تتمے کے طور پر یوں ذِکر فرمایا "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" ابن کثیر اِس آیت کے تحت رَقمطراز ہیں:

"قال ابن عباس وعطاء ومجاهد وعکرمة والحسن: یعنی بذلک نحر البدن ونحوها، وکذا قال قتادة ومحمد بن کعب القرظی، والضحاک والربیع وعطاء الخراسانی والحکم وإسماعیل بن أبی خالد وغیر واحد من السلف"۔(۱۰)

"حضرت اِبن عباس رَضی اللہ عنہما، حضرت عطاء، مجاہد، عکرمہ رحمہم اللہ سمیت متعدد مفسرین فرماتے ہیں کہ "وانحر" سے اُونٹ کا "نحر" ہی مطلوب ہے، جو قربانی کے لیے جانے والے جانور میں سے بڑا جانور ہے"۔

اِس سے فقہاء نے مسئلہ بھی اخذ فرمایا ہے کہ عیدالاضحیٰ پڑھنے والے لوگوں پر لازم ہے کہ وہ نمازِ عید پہلے ادا کرلیں، اس کے بعد قربانی کریں، جن لوگوں پر عید کی نماز فرض ہے، اگر اُنہوں نے عید سے پہلے قربانی کر دِی تو اُن کی قربانی نہیں ہوگی۔

۸:-"لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (۲۸)"۔(۱۱)

ترجمہ:"تاکہ یہ سب آنے والے اپنے اپنے فائدوں کی غرض سے پہنچ جائیں اور تاکہ قربانی کے مقرر دِنوں میں خدا کا نام لیں جو خدا نے ان کو عطاء کیے ہیں، سوائے اُمت محمدیہ! تم ان قربانیوں میں سے خود بھی کھانا چاہو تو کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ"۔

اِس آیت میں بھی قربانی ہی کا ذِکر ہے۔ ہر قوم میں نسک اور قربانی رَکھی گئی، جس کا بنیادی مقصد خالق کائنات کی یاد، اس کے احکام کی بجا آوری اس جذبے کے ساتھ کہ یہ سب کچھ اللہ کی عطا اور دین ہے، یہاں بھی اِنسان کی قلبی کیفیت کا ایسا اِنقلاب مقصود ہے کہ وہ مال ومتاع کو اپنا نہ سمجھے؛ بلکہ دِل وجان سے اس عقیدے کی مشق کرے کہ حق تعالیٰ ہی اس کا حقیقی مالک ہے، گویا قربانی کا عمل فتنۂ مال سے حفاظت کا دَرس دیتا ہے۔

۹:-"وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ"(۱۲)

ترجمہ:۔"اور ہم نے ہر اُمت کے لیے اس غرض سے قربانی کرنا مقرر کیا تھا کہ وہ ان چوپایوں کی قسم کے مخصوص جانوروں کو قربان کرتے وَقت اللہ کا نام لیا کریں، جو اللہ نے ان کو عطا کیے تھے"۔

قربانی احادیث مبارکہ کی روشنی میں

۱:-"عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ اتی یوم القیامة بقرونھا واشعارھا وظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفسا"۔(۱۳)

ترجمہ:۔"حضرت عائشہ رَضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اِبن آدم (اِنسان) نے قربانی کے دِن کوئی ایسا عمل نہیں کیا، جو اللہ کے نزدِیک خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادَہ پسندیدہ ہو، اور قیامت کے دِن وہ ذبح کیا ہوا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا، اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوجاتا ہے، لہٰذا تم اس کی وَجہ سے (قربانی کرکے) اپنے دِلوں کو خوش کرو"۔

۲:-"عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ قال: قال أصحاب رسول اللہ: یا رسول اللہ! ما ھذہ الأضاحی؟ قال: سنة أبیکم إبراھیم علیہ السلام، قالوا: فما لنا فیھا یا رسول اللہ؟ قال: بکل شعرة حسنة، قالوا: فالصوف؟ یا رسول اللہ! قال: بکل شعرة من الصوف حسنة"۔(۱۴)

ترجمہ:۔"حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ راوِی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رَضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟ فرمایا: تمہارے باپ اِبراہیم علیہ السلام کا طریقہ (یعنی اُن کی سنت) ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ پھر اس میں ہمارے لیے کیا (اجروثواب) ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (جانور کے) ہر بال کے بدلے ایک نیکی، اُنہوں نے عرض کیا کہ (دُنبہ وَغیرہ اگر ذبح کریں تو اُن کی) اُون (میں کیا ثواب ہے؟) فرمایا: کہ اُون کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی"۔

۳:-"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی یوم اضحیٰ: ما عمل آدمی فی ھذا الیوم افضل من دم یھراق إلا أن یکون رحماً توصل"۔(۱۵)

ترجمہ:۔"حضرت اِبن عباس سے رِوَایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کے دِن اِرشاد فرمایا: آج کے دِن کسی آدمی نے خون بہانے سے زیادَہ افضل عمل نہیں کیا، ہاں! اگر کسی رِشتہ دار کے ساتھ حسن سلوک اس سے بڑھ کر ہو تو ہو"۔

۴:-"عن أبی سعید رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا فاطمة! قومی إلی أضحیتک فاشھدیھا، فإن لک بأول قطرة تقطر من دمھا أن یغفر لک ما سلف من ذنوبک قالت: یا رسول اللہ! ألنا خاصة أھلَ البیت أو لنا وللمسلمین؟ قال: بل لنا وللمسلمین"۔

ترجمہ:۔"حضرت ابوسعید رَضی اللہ عنہ سے رِوَایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی بیٹی حضرت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے) فرمایا: اے فاطمہ! اُٹھو اور اپنی قربانی کے پاس رہو (یعنی اپنی قربانی کے ذبح ہوتے وقت قریب

موجود رہو) کیونکہ اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے کے ساتھ ہی تمہارے پچھلے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے، حضرت فاطمہ رَضی اللہ عنہا نے عرض کیا! اللہ کے رسول! یہ فضیلت ہم اہل بیت کے ساتھ مخصوص ہے یا عام مسلمانوں کے لیے بھی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہمارے لیے بھی ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے بھی"۔

۵:-"عن علی رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا فاطمۃ! قومی فاشھدی ضحیتک، فإن لک بأول قطرۃ تقطر من دمھا مغفرۃ لکل ذنب، ما انہ یجاء بلحمھا و دمھا توضع فی میزانک سبعین ضعفا۔ قال ابو سعید: یا رسول اللہ! ھذا لآل محمد خاصۃ، فانھم اھل لما خصوا بہ من الخیر، و للمسلمین عامۃ؟ قال: لآل محمد خاصۃ، و للمسلمین عامۃ"۔(۱۶)

ترجمہ:۔"حضرت علی رَضی اللہ عنہ سے رِوَایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وَسلم نے (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے) فرمایا: اے فاطمہ! اُٹھو اور اپنی قربانی کے پاس (ذبح کے وقت) موجود رہو؛ اِس لیے کہ اس کے خون کا پہلا قطرہ گرنے کے ساتھ ہی تمہارے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے، یہ قربانی کا جانور قیامت کے دِن اپنے گوشت اور خون کے ساتھ لایا جائے گا اور تمہارے ترازو میں ستر گنا (زیادہ) کر کے رَکھا جائے گا، حضرت ابوسعیدؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ فضیلت خاندانِ نبوت کے ساتھ خاص ہے جو کسی بھی خیر کے ساتھ مخصوص ہونے کے حق دار ہیں یا تمام مسلمانوں کے لیے ہے؟ فرمایا: یہ فضیلت آلِ محمد کے لیے خصوصاً اور عموماً تمام مسلمانوں کے لیے بھی ہے"۔

۶:-"عن علی رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا أیھا الناس! ضحوا و احتسبوا بدمائھا، فان الدم و إن وقع فی الأرض، فإنہ یقع فی حرز اللہ عز و جل"۔(۱۷)

ترجمہ:۔"حضرت علی رَضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! تم قربانی کرو اور ان قربانیوں کے خون پر اجر وثواب کی اُمید رَکھو؛ اِس لیے کہ (اُن کا) خون اگرچہ زمین پر گرتا ہے؛ لیکن وہ اللہ کے حفظ وامان میں چلا جاتا ہے"۔

۷:-"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما انفقت الورق فی شیئٍ أحب إلی اللہ من نحر ینحر فی یوم عید"۔(۱۸)

ترجمہ:۔"حضرت اِبن عباس رَضی اللہ عنہ سے رِوَایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وَسلم نے فرمایا: چاندی (یا کوئی بھی مال) کسی ایسی چیز میں خرچ نہیں کیا گیا جو اللہ کے نزدِیک اُس اُونٹ سے پسندیدہ ہو جو عید کے دِن ذبح کیا گیا"۔

۸:-"عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وجد سعۃ لان یضحی فلم یضح، فلایحضر مصلانا"۔(۱۹)

ترجمہ:۔"حضرت ابو ہریرہ رَضی اللہ عنہ سے رِوَایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص قربانی

کرنے کی گنجائش رکھتا ہو، پھر بھی قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے"۔

۹:-"عن حسین بن علی رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ضحی طیبۃ نفسہ محتسباً لاضحیتہ کانت لہ حجاباً من النار۔"(۲۰)

ترجمہ:-"حضرت حسین بن علی رَضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وَسلم نے فرمایا: جو شخص خوش دِلی کے ساتھ اجر وثواب کی اُمید رَکھتے ہوئے قربانی کرے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے رُکاوَٹ بن جائے گی"۔

قربانی کا فلسفہ

"والثانی: یوم ذبح ابراھیم ولدہ اسماعیل علیھما السلام، وانعام اللہ علیھما: بان فداہ بذبح عظیم، اذ فیہ تذکر حال ائمۃ الملۃ الحنیفیۃ والاعتبار بھم فی بذل المھج، والاموال فی طاعۃ اللہ، وقوۃ الصبر، وفیہ تشبہ بالحاج، وتنویہ بھم، وشوق لماھم فیہ ولذلک سن التکبیر"۔(۲۱)

ترجمہ:-"اور دُوسرا (عیدالاضحیٰ) وہ دِن ہے کہ جس میں حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اِسماعیل علیہ السلام کے ذبح (کا اِرادہ کیا)، اور اللہ کا اُن پر اِنعام ہوا کہ حضرت اِسماعیل علیہ السلام کے بدلے عظیم ذبیحہ (جنتی مینڈھا) عطا فرمایا؛ اِس لیے کہ اس میں ملت اِبراہیمی کے ائمہ کے حالات کی یاد دِہانی ہے، اللہ کی اِطاعت میں اُن کے جان ومال کو خرچ کرنے اور اِنتہائی دَرجہ صبر کرنے کے وَاقعہ سے لوگوں کو عبرت دِلانا مقصود ہے، نیز اس میں حاجیوں کے ساتھ مشابہت ہے اور ان کی عظمت ہے اور جس کام میں وہ مشغول ہیں اُس میں اُن کو رَغبت دِلانا ہے، یہی وَجہ ہے کہ تکبیرات (تشریق) کو مسنون کیا گیا ہے"۔

قربانی کی حقیقت

مندرجہ بالا آیات واحادِیث کی روشنی میں قربانی کی حقیقت معلوم ہوئی، اس کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے:

۱:-قربانی سنت اِبراہیمی کی یادگار ہے۔

۲:-قربانی کی ایک صورَت ہے اور ایک رُوح ہے، صورَت تو جانور کا ذبح کرنا ہے، اور اس کی حقیقت اِیثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب اِلی اللہ ہے۔(۲۲)

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرتا؛ مگر خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے، ان کو یہ گوارا نہ ہوا؛ اِس لیے حکم دِیا کہ تم جانور کو ذبح کرو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دِیا۔ اِس وَاقعہ (ذبح اِسماعیل علیہ السلام) سے معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے؛ چنانچہ اس سے اِنسان میں جاں

سپاری اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی رُوح ہے تو یہ رُوح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی؟ کیونکہ قربانی کی رُوح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی رُوح مال دینا ہے، نیز صدقہ کے لیے کوئی دِن مقرر نہیں؛ مگر اس کے لیے ایک خاص دِن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی یوم النحر اور یوم الاضحیٰ رکھا گیا ہے۔(۲۳)

قربانی کی اصل حکمت وفلسفہ

حضرت شاہ وَلی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"والسر فی الهدی التشبة بفعل سیدنا إبراهیم علیه السلام فیما قصد من ذبح ولده فی ذلک المکان طاعةً لربه، وتوجهاً إلیه، والتذکر لنعمة الله به وبأبیهم إسماعیل علیه السلام، وفعل مثل هذا الفعل فی هذا الوقت والزمان ینبه والنفس ای تنبه وإنما وجب علی المتمتع والقارن شکراً لنعمة الله حیث وضع عنهم أمر الجاهلیة فی تلک المسئلة۔"(۲۴)

ترجمہ:"(حج کے موقع پر) ہدی میں حکمت یہ ہے کہ اس میں حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے ساتھ مشابہت ہے، اُنہوں نے اپنے رَب کے حکم بجا آوری اور اس کی طرف توجہ کی نیت سے اس جگہ اپنے بیٹے حضرت اِسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا چاہا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت اِسماعیل علیہ السلام پر جو اِنعامات کیے ہیں، اُن کی یاددہانی ہوتی ہے، اور حج تمتع وقران کرنے والے پر یہ ہدی واجب ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا ہو کہ اس نے معاملے میں جاہلیت کے وبال کو دُور کر دِیا"۔

قربانی کا حکم

قربانی کی دو قسمیں ہیں: ایک واجب، دوسری مستحب۔

اگر کوئی آدمی، عاقل، بالغ، آزاد، مقیم، مسلمان اور مال دار ہو تو اس پر قربانی کرنا واجب ہے، اور قربانی نہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔ اگر کوئی مسلمان سفر میں ہو یا فقیر وغریب، ہو یا محتاج ہو اور قربانی کرے تو یہ مستحب ہے۔ جس طرح زکوٰۃ صاحب نصاب مسلمان پر الگ الگ لازم ہوتی ہے، اِسی طرح قربانی بھی ہر صاحب نصاب پر الگ الگ لازم ہوگی؛ چنانچہ ایک قربانی ایک گھرانے کی طرف سے کافی ہونے کا خیال دُرست نہیں ہے اور ہر مال دَار مقیم مسلمان شخص پر قربانی اس کے اپنے نفس اور ذَات پر وَاجب ہوتی ہے؛ اِس لیے پورے گھر، خاندان یا کنبے کی طرف سے ایک آدمی کی قربانی کافی نہیں ہوگی؛ بلکہ ہر صاحب نصاب پر الگ الگ قربانی لازم ہوگی، ورنہ سب لوگ گنہگار رہوں گے، ہاں مُردوں کے اِیصالِ ثواب کے لیے ایک قربانی کئی افراد کے ثواب کی نیت سے کر سکتے ہیں۔

مُردوں کے اِیصالِ ثواب کے لیے یا زندہ لوگوں کو ثواب پہنچانے کے لیے قربانی کرنا جائز ہے، اگر کسی آدمی نے قربانی کی نذر مانی یا فقیر نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تو اُن پر قربانی واجب ہے۔

وجوبِ قربانی کی شرائط

کسی شخص پر قربانی اُس وقت واجب ہوتی ہے، جب اس میں چھ شرائط پائی جائیں: اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو قربانی کا وجوب ساقط ہوجائے گا اور قربانی وَاجب نہ رہے گی۔

۱-عاقل ہونا، کسی پاگل، مجنون وَغیرہ پر قربانی وَاجب نہیں۔

۲-بالغ ہونا، نابالغ پر قربانی نہیں، خواہ مال دَار ہی ہو، اگر کوئی ایامِ قربانی میں بالغ ہوا اور مال دار ہے تو اُس پر قربانی واجب ہے۔

۳-آزاد ہونا، غلام پر قربانی نہیں۔

۴-مقیم ہونا، مسافر پر قربانی وَاجب نہیں۔ ہاں! اگر مسافر مال دَار ہے اور قربانی کرتا ہے تو اس کو قربانی کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔

۵-مسلمان ہونا، غیر مسلم پر (خواہ کسی مذہب کا ہو) قربانی واجب نہیں۔ ہاں اگر کوئی غیر مسلم ایامِ قربانی میں مسلمان ہوگیا اور وہ صاحبِ نصاب ہو تو اُس پر بھی قربانی واجب ہے۔

۶-صاحب نصاب ہونا، لہٰذا فقیر پر قربانی واجب نہیں؛ لیکن اگر فقیر اپنی خوشی سے قربانی کرے تو اسے ثواب ملے گا۔ اگر کسی آدمی کے پاس نصاب کی مقدار رقم موجود ہو؛ مگر اُس پر اِتنا قرض ہو جو اگر وہ ادَا کرے تو اس کو صاحب نصاب ہونے سے نکال دے، ایسے شخص پر قربانی واجب نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ہر عاقل، بالغ، آزاد، مقیم، مسلمان اور صاحب نصاب پر قربانی واجب ہے۔

وجوبِ قربانی کا نصاب

قربانی ہر اُس عاقل، بالغ، مقیم، مسلمان پر واجب ہوتی ہے جو نصاب کا مالک ہو یا اس کی ملکیت میں ضرورتِ اصلیہ سے زائد اِتنا سامان ہو جس کی مالیت نصاب تک پہنچتی ہو اور اس کے برابر ہو، نصاب سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس ساڑھے سات تولہ صرف سونا، یا ساڑھے باوَن تولہ چاندی یا اُس کی قیمت کے برابر نقد رَقم ہو، یا ضرورَتِ اصلیہ سے زائد اِتنا سامان ہو جس کی قیمت ساڑھے باوَن تولہ چاندی کے برابر ہو۔

وَاضح رہے کہ ضرورتِ اصلیہ سے مراد وہ ضرورت ہے جو اِنسان کی جان یا اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے ضروری ہو، اُس ضرورت کے پورا نہ ہونے کی صورت میں جان جانے یا ہتک آبرو کا اندیشہ ہو، مثلاً کھانا، پینا، رہائش کا مکان، پہننے کے کپڑے، اہل صنعت وحرفت کے اوزار، سفر کی گاڑی، سواری وَغیرہ، نیز اس کے لیے اُصول یہ ہے کہ جس پر صدقہ فطر واجب ہے اُس پر قربانی بھی واجب ہے یعنی نصاب کے مال کا تجارَت کے لیے ہونا یا اُس پر سال گزرنا ضروری

نہیں؛ چونکہ نصاب کے لیے ضرورَتِ اصلیہ سے زائد مال کا اعتبار ہوتا ہے؛ اِس لیے یاد رکھنا چاہیے کہ بڑی بڑی دیگیں، بڑے فرش، شامیانے، ریڈیو، ٹیپ رِیکارڈر، عام رِیکارڈر، ٹیلی وِیژن، وِی سی آر یہ ضرورت میں دَاخل نہیں، اگر ان کی قیمتیں نصاب تک پہنچ جائیں تو بھی ایسے شخص پر قربانی واجب ہوگی۔

اگر کسی کے پاس مالِ تجارت، مثلاً: شیئرز، جیولری کا کام، فریج، گاڑیاں، پنکھے وَغیرہ کسی طرح کا مال ہو اور بقدرِ نصاب یا اس سے زیادَہ ہو تو اُس پر بھی قربانی وَاجب ہے۔ اگر کوئی فقیر آدمی قربانی کے ایام میں سے کسی دِن بھی صاحب نصاب ہو گیا تو اُس پر قربانی وَاجب ہو جائے گی۔ اگر کوئی صاحب نصاب کافر قربانی کے ایام میں مسلمان ہو جائے تو اُس پر قربانی لازم ہوگی۔ اگر عورَت صاحب نصاب ہو تو اُس پر بھی قربانی وَاجب ہے، بیوی کی قربانی شوہر پر لازم نہیں، اگر بیوی کی اِجازت سے کر لے تو ہو جائے گی۔ بعض لوگ نام بدل کر قربانی کرتے رہتے ہیں، باوجود یہ کہ دونوں میاں بیوی صاحب نصاب ہوتے ہیں، مثلاً: ایک سال شوہر کے نام سے، دوسرے سال بیوی کے نام سے، تو اس سے قربانی ادا نہیں ہوتی؛ بلکہ ہر صاحب نصاب میاں، بیوی پر علیحدہ علیحدہ قربانی ہوتی ہے۔

اگر بیوی کا مہر موجل (یعنی اُدھار) ہے جو شوہر نے ابھی تک نہیں دِیا اور وہ نصاب کے برابر ہے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔ اور اگر مہر معجّل (یعنی فوری طور پر نقد) ہے اور نصاب کے برابر یا اُس سے زیادَہ ہے تو اس پر بھی قربانی وَاجب ہے۔ اگر مشترک کارُوبار کی مالیت تقسیم کے بعد ہر ایک کو بقدرِ نصاب یا اُس سے زائد پہنچتی ہو تو سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر کاشت کار، کسان کے پاس ہل چلانے اور دُوسری ضرورَت سے زائد اِتنے جانور ہوں جو بقدرِ نصاب ہوں تو اُس پر قربانی ہوگی اور اگر وہ جانور نصاب کی مقدار کے برابر نہ ہوں تو واجب نہ ہوگی۔ اگر کسی کے پاس کتب خانہ ہے اور مطالعہ کے لیے کتب رکھی ہیں تو اگر وہ خود تعلیم یافتہ نہیں اور کتابوں کی قیمت نصاب تک پہنچی ہوئی ہے تو اُس پر قربانی واجب ہے اور اگر صورَتِ مذکورَہ میں وہ تعلیم یافتہ ہے تو قربانی وَاجب نہیں ہوگی۔ ہر سرکارِی وغیر سرکارِی ملازم جس کی تنخواہ اِخراجات نکالنے کے بعد نصاب کے بقدر یا اس سے زائد بچ جائے تو اس پر قربانی واجب ہے۔

حوالہ جات

(۱) المائدہ:۱۸۳۔(۲) تفسیر ابن کثیر ۲/۵۱۸، مکتبہ فاروقیہ پشاور۔(۳) الحج:۳۶۔۳۷۔(۴) الحج:۳۲۔ (۵) آل عمران: ۳۸۱۔(۶) المائدۃ:۲۷ ۔(۷) انعام:۱۶۲ ۔(۸) البقرۃ:۱۹۶۔(۹) احکام القرآن ۳/۳۶۔(۱۰) ابن کثیر، ۶/۵۵۶، مکتبہ فاروقیہ پشاور۔ (۱۱) الحج:۸۳۔(۱۲) الحج:۳۴۔(۱۳) مشکوٰۃ المصابیح ۔(۱۴) مشکوٰۃ: ۱۲۹۔(۱۵) الترغیب والترھیب:۲/۲۷۷۔(۱۶) الترغیب والترھیب: ۲/۲۷۷۔ ۲۷۸۔ (۱۷) ایضاً:۲۷۸ ۔(۱۸)ایضاً ۔(۱۹)ایضاً ۔(۲۰)ایضاً ۔(۲۱)حجۃ اللہ البالغۃ:۲/۱۰۰(۲۲)سنت حضرت خلیل، قاری طیب ص: ۹۔(۲۳)ایضاً، ص: ۱۶۔(۲۴)حجۃ اللہ البالغۃ، ابواب الحج، ۲/۶۸۔

فلسفۂ قربانی اور ملحدین کے شکوک وشبہات

مفتی محمد راشد ڈسکوی

اسلام کا فارسی میں ترجمہ ہے: گردن نہادن، اردو میں گردن جھکانا، خم کرنا، جب گردن جھکانے کا محرک اطاعت وفرمانبرداری کے جذبات ہوں تو اُسے اردو میں تسلیم خم بھی کہا جاتا ہے۔ اطاعت وفرمانبرداری کے جذبہ سے گردن جھکانے والے کو مسلم کہتے ہیں، اسی سے مسلم یا مسلمان اصطلاح سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان یا مسلم احکام الٰہی کے سامنے تسلیم خم کرنے یا گردن جھکانے والے کو کہتے ہیں۔ مسلمان کا جذبۂ ایمانی ہمیشہ اُسے تیار رکھتا ہے کہ جو بھی حکم الٰہی جب اور جیسے اس کی طرف متوجہ ہو، اُسے بجالایا جائے، وہ اُسے بلاچوں وچرا قبول کر لیتے ہیں، لیکن بعض کج رو، کج فہم اور کوتاہ نظر اپنے مقامِ حقارت سے اوپر اچھل اچھل کر اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو اپنی ناقص عقل کی گھسی پٹی کسوٹی پر پرکھ کر قبول یا رد کرنے کی ناروا جسارت کرنے لگتے ہیں اور ایسے لوگ جب ابلاغی ذرائع کا حصہ ہوں یا ذرائع ابلاغ تک ان کی رسائی میں کوئی مشکل نہ ہو تو وہ اسلامی احکام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور اپنی کج فہمی کے مسموم جراثیم مسلمانوں کے درمیان عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی اسلامی احکام میں اہم پر حکمت حکم، قربانی کا حکم بھی ہے جو امت مسلمہ سالانہ بجالاتی ہے اور بھرپور جذبۂ ایمانی سے ادائیگی کا اہتمام کرتی ہے، مگر ایک عرصہ سے بعض نادان اس سنت ابراہیمی سے متعلق اپنے فاسد خیالات کو عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لیے ماہ ذوالحجہ کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوا کہ قربانی سے متعلق ایسے ملحدین کے سطحی شکوک وشبہات کا علمی جائزہ لیا جائے، آئندہ سطور میں یہی کوشش کی جارہی ہے۔

ہر جدید تہذیب وتمدن کا دلدادہ اور مغربیت سے متأثر ذہنیت رکھنے والا اس ماہِ مبارک کے شروع ہوتے ہی سادہ لوح اور مذہب پسند مسلمانوں کا ذہن خراب کرنا شروع کر دیتا ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کشی ہوتی ہے، لاکھوں لوگوں کی یہ رقمیں بلاوجہ ضائع ہوتی ہیں، اس کے بجائے اگر اتنا مال رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے خرچ کیا جائے، تو معاشرے کے بہت بڑے غریب اور مفلس طبقے کا بھلا ہو جائے گا، یہ افراد بھی زندگی کی ضروری سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے، وغیرہ وغیرہ، اس طرح منکرینِ قربانی اپنی عقلِ نارسا سے کام لیتے ہوئے بزعمِ خود قربانی کے نقصانات اور ترکِ قربانی کے فوائد بیان کرتے نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ سے عام مسلمان ان نام نہاد دانشوروں کے زہریلے پروپیگنڈے اور بہکاوے میں آکر اسلام کے اس عظیم الشان حکم کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ان دنوں (دس ذوالحجہ) میں دائمی عمل

اس صورتِ حال میں سب سے پہلے تو غور کرنے کی یہ بات ہے کہ عیدالاضحیٰ کے اس خاص موقع پر اگر قربانی کرنے کی بنسبت انسانیت کی فلاح و بہبود میں مال خرچ کرنا اتنا ہی افضل، موزوں و مناسب یا ضروری ہوتا تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں اہلِ ثروت اور صاحبِ نصاب مسلمانوں پر قربانی کے حکم کے بجائے غریب، سسکتی اور بدحال انسانیت پر مال خرچ کرنا ضروری قرار دیا جاتا، جب کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر دور میں غریب اور نادار طبقہ موجود رہا ہے، تو یقینا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک دور میں بھی یہ طبقہ موجود تھا، بلکہ ایسے افراد تو بکثرت موجود تھے، لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (جو اپنی امت کے لیے بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان تھے) نے اپنے زمانہ کے اہلِ ثروت اور صاحبِ نصاب مسلمانوں کو اس (عیدالاضحیٰ کے) موقع پر یہ حکم نہیں دیا کہ وہ اپنا مال رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کریں، بلکہ یہ حکم فرمایا کہ اس موقع پر اللہ کے حضور جانور کی قربانی پیش کریں۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دائمی عمل ان دنوں میں قربانی کرنے کا ہی تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا (اس قیام کے دوران) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قربانی کرتے رہے'' **عن ابن عمر رضي الله عنه قال: أقام رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة عشر سنين، يضحي**''۔ (**سنن الترمذي، الأضاحي، باب الدليل على أن الأضحية سنة، رقم الحديث: ۱۵۰۷**)

اور صحابہ کرامؓ کا اس عظیم حکم کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنا ہی افضل، اولیٰ اور ضروری ہے۔

ایامِ قربانی میں قربانی افضل ہے یا نقد صدقہ؟

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: ''قربانی کے ایام میں بنسبت صدقہ کرنے کے قربانی کرنا افضل ہے''۔ امام ابوداؤد، امام ربیعہ اور ابوالزناد رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ (**المغني لابن قدامه: ۱۱/ ۶۹**) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ان کے بعد خلفائے راشدین کا یہی عمل تھا۔ اگر ان حضرات کے نزدیک اس سے بہتر کوئی عمل ہوتا تو وہ یقینا قربانی کی بجائے اسی کو اختیار کرتے، دوسری بات یہ کہ ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا، جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا صریح فرمان مبارک موجود ہے کہ: ''اس دن میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک (قربانی کے جانور کا) خون بہانے سے بڑھ کر بنی آدم کا کوئی عمل پسندیدہ نہیں ہے۔'' (**عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "ما عمل آدمي من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم۔**'' (**سنن الترمذي، فضل الأضحية، رقم الحديث: ۱۴۹۳**)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی کام میں

مال خرچ کیا جائے تو وہ عیدالاضحیٰ کے دن قربانی میں خرچ کیے جانے والے مال سے افضل نہیں''۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''ماأنفقت الورق فی شیئ أفضل من نحیرۃ فی یوم العید''۔(سنن الدارقطنی، کتاب الأشربۃ، باب الصیدو الذبائح و الأطعمۃ، رقم الحدیث:۴۳)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرح ذکر کرتے ہیں کہ صحیح احادیثِ مشہورہ کی بنا پر شوافع کے نزدیک ان دنوں میں قربانی کرنا ہی افضل ہے، نہ کہ صدقہ کرنا، اس لیے کہ اس دن قربانی کرنا شعارِ اسلام ہے، یہی مسلک سلف صالحین کا ہے۔ (المجموع شرح المھذب: ۸/ ۴۲۵)۔البتہ! وہ افراد جن پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، اُن کے لیے یا اُن کی طرف سے قربانی کرنے کی بجائے صدقہ کرنا افضل شمار ہوگا۔(البحر الرائق:۸/ ۲۰۲) صاحب مرعاۃ المفاتیح شارح مشکاۃ المصابیح لکھتے ہیں کہ: ''بعض فقہاء کے نزدیک قربانی واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ، لیکن بہرصورت اس دن میں قربانی کرنا یعنی: خون بہانا متعین ہے، اس عمل کو چھوڑ کر جانور کی قیمت صدقہ کر دینا کافی نہیں ہوگا، اس لیے کہ صدقہ کرنے میں شعائر اسلام میں سے ایک بہت بڑے شعار کا ترک لازم آتا ہے، چنانچہ! اہل ثروت پر قربانی کرنا ہی لازم ہے۔''(مرعاۃ المفاتیح:۵/ ۷۳)

کیا قربانی سے جانوروں کی نسل کُشی ہوتی ہے؟

ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ نظام چلا آ رہا ہے کہ انسانوں یا جانوروں کو جس چیز کی ضرورت جتنی زیادہ ہوتی ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی پیدائش اور پیداوار بڑھا دیتے ہیں اور جس چیز کی جتنی ضرورت کم ہوتی ہے تو اس کی پیداوار بھی اتنی ہی کم ہو جاتی ہے، آپ پوری دنیا کا سروے کریں، اچھی طرح جائزہ لیں کہ جن ممالک میں قربانی کے اس عظیم الشان حکم پر عمل کیا جاتا ہے، کیا ان ممالک میں قربانی والے جانور، ناپید ہو چکے ہیں یا پہلے سے بھی زیادہ موجود ہیں؟! آپ کبھی اور کہیں سے بھی یہ نہیں سنیں گے کہ دنیا سے حلال جانور ختم ہو گئے ہیں یا اتنے کم ہو گئے ہیں کہ لوگوں کو قربانی کرنے کے لیے جانور ہی میسر نہیں آئے، جبکہ اس کے برخلاف کتے اور بلیوں کو دیکھ لیں، ان کی نسل ممالک میں کتنی ہے؟! حالاں کہ تعجب والی بات یہ ہے کہ کتے اور بلیاں ایک ایک حمل سے چار چار پانچ پانچ بچے جنتے ہیں، لیکن ان کی تعداد حلال جانوروں کے مقابلہ میں بہت کم نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ قرآن پاک کی آیت: ''وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْئٍ فَهُوَ يُخْلِفُه'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے تمہیں اس کا بدل دے دیتے ہیں، کبھی دنیا میں اور کبھی آخرت میں اور کبھی دونوں میں۔ کائناتِ عالَم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے، انسان اور جانور اس کو بے دھڑک خرچ کرتے ہیں، کھیتوں اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں،

وہ پانی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اس کی جگہ اور نازل ہوجاتا ہے، اسی طرح زمین سے کنواں کھود کر جو پانی نکالا جاتا ہے، اس کو جتنا نکال کر خرچ کرتے ہیں اس کی جگہ دوسرا پانی قدرت کی طرف سے جمع ہوجاتا ہے۔ انسان غذا کھا کر بظاہر ختم کر لیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری غذا مہیا کر دیتے ہیں۔ بدن کی نقل وحرکت اور محنت سے جو اجزاء تحلیل ہوجاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے اجزاء بدل بن جاتے ہیں۔ غرض انسان دنیا میں جو چیز خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے قائم مقام اس جیسی دوسری چیز دے دیتے ہیں۔ کبھی سزا دینے کے لیے یا کسی دوسری تکوینی مصلحت سے اس کے خلاف ہوجانا اس ضابطۂ الٰہیہ کے منافی نہیں۔

''اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیا صرف انسان اور حیوانات کے لیے پیدا فرمائی ہیں، جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں، ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہوتا ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے اور شرعی قربانیوں اور کفارات وجنایات میں ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ اس کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں، جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہے، کتے بلی کی تعداد اتنی نہیں، حالانکہ کتے بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہیے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں، گائے بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے دیتی ہے، گائے بکری ہر وقت ذبح ہوتی ہے، کتے بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر بھی یہ مشاہدہ ناقابلِ انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بنسبت کتے بلی کے زیادہ ہے۔ جب سے ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگی ہے، اس وقت سے وہاں گائے کی پیداوار گھٹ گئی ہے، ورنہ ہر بستی اور ہر گھر گایوں سے بھرا ہوتا جو ذبح نہ ہونے کے سبب بچی رہیں۔ عرب نے جب سے سواری اور بار برداری میں اونٹوں سے کام لینا کم کر دیا، وہاں اونٹوں کی پیداوار بھی گھٹ گئی، اس سے اس ملحدانہ شبہ کا ازالہ ہوگیا، جو احکامِ قربانی کے مقابلہ میں اقتصادی اور معاشی تنگی کا اندیشہ پیش کر کے کیا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، سورۃ السبأ:۳۹، ج:۷، ص:۳۰۳)

رفاہی کاموں کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے

ہماری اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے غریب ومساکین اور ناداروں پر خرچ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہمارا مقصود محض یہ ہے کہ دس ذوالحجہ سے لے کر بارہ ذوالحجہ کی شام تک جس شخص پر قربانی کرنا واجب ہے، اس کے لیے قربانی چھوڑ کر اس رقم کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! جس شخص پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، اس کے لیے ان دنوں میں یا صاحبِ نصاب لوگوں کے ان دنوں میں قربانی کرنے کے ساتھ ساتھ یا سال کے دیگر ایام میں مالی صدقہ کرنا یقیناً بہت زیادہ ثواب کی چیز ہے۔ رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے خرچ کرنے کے لیے اسلام نے زکاۃ، صدقۃ الفطر، عشر، کفارات، نذور،

میراث، دیگر وجوبی صدقات اور ہدایا وغیرہ کا نظام وضع کیا ہوا ہے، ان احکامات کو پوری طرح عملی جامہ پہنا کر مطلوبہ نتائج ومقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں، نہ یہ کہ اسلام کے ایک عظیم الشان حکم کو مسخ کر کے تلبیس سے کام لیا جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ معاشرے میں ہونے والی خرافات پر تفصیلی نظر ڈالی جائے، طرح طرح کی مروج رسومات میں ضائع ہونے والے اربوں وکھربوں کی مالیت کے روپے کو کنٹرول کیا جائے، نہ کہ ایک فریضے میں صرف کرنے والوں لوگوں کو بھی بہکا کر اس سے روک دیا جائے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''منکرینِ قربانی نے اپنی عقلِ نارسا سے کام لیتے ہوئے بزعمِ خود قربانی کے مضرات اور نقصانات اور ترکِ قربانی کے فوائد بیان کیے ہیں، مثلاً: یہ کہا ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کُشی ہوتی ہے اور لوگوں کی رقمیں بلاوجہ ضائع ہوتی ہیں، اگر یہ رقوم رفاہِ عامہ کے کسی مفید کام میں صَرف کی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو، وغیرہ وغیرہ، مگر یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو (جو حکیم علی الاطلاق ہے اور اس کا کوئی حکم عقل کے خلاف اور خالی از حکمت نہیں ہوتا) محض ان طفل تسلیوں سے کیوں کر رد کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کو قربانی کا حکم دیتے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ قربانی سے جانوروں کی نسل کشی ہوتی ہے اور اس کے یہ نقصانات ہیں؟ رب تعالیٰ کے صریح احکام میں معاذ اللہ کیڑے نکالنا کون سا ایمان ہے؟! اور پھر جناب خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح اور صریح قولی فعل اور اُمتِ مسلمہ کے عمل کو جو تواتر سے ثابت ہوا ہے، خلافِ عقل یا مضر بتانا کون سا دین ہے؟!''۔ (مسئلہ قربانی مع رسالہ سیف یزدانی، ص: ۱۲)

حضرت مولانا مفتی محمد رضوان صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ''بعض لوگ روحانیت سے غافل ہو کر یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ قوم کا اتنا روپیہ جو تین دن میں جانوروں کے ذبح پر ہر سال خرچ ہو جاتا ہے اور اس کا خاطر خواہ مفاد نظر نہیں آتا، اگر یہی پیسہ رفاہی اور قومی مفادات پر لگایا جائے تو بہت فائدہ ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور اہم عبادت ہے، جیسے: حج کرنا، زکاۃ دینا، اور دوسری عبادات۔ تو کیا ان عبادات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ فضول خرچی اور مال کو بے جا خرچ کرنا ہے؟! اس طرح تو دین کا بہت بڑا حصہ اور بہت سے دینی احکام ہی کا اسلام سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ پس جب شریعت میں قربانی کا حکم ہے تو اسے عقلی اعتراضوں اور ذہنی ڈھکوسلوں کا شکار بنانا کسی طرح درست نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والی دوسری اور اصل فضول خرچیاں (جن کا شریعت نے حکم بھی نہیں دیا) ان لوگوں کو نظر نہیں آتیں، جبکہ اصل میں تو ان کے ختم کرنے اور مٹانے کی ضرورت ہے، ملک کی کتنی بڑی تعداد ایسی ہے جو سگریٹ نوشی، منشیات، کرکٹ، ہاکی اور دوسرے کھیل، جوئے بازی، گھوڑ دوڑ، ناچ گانا، فحش پروگرام، انٹرنیٹ، ٹی وی، کیبل، وی سی آر، سینما، فضول تصویر سازی اور مووی بازی اور دوسرے فحش میڈیائی پروگرام، فحش اخبار ورسائل اور دیگر ناول

اور ڈائجسٹ، بسنت، عید کارڈ، شادی کارڈ، گانوں اور دیگر غلط پروگراموں کی آڈیو وویڈیو کیسٹیں اور سی ڈیز، ویڈیو گیمز، آتش بازی، شادی بیاہ، مرگ وموت اور غمی خوشی کی رسومات، مختلف فیشن، غیر شرعی بیوٹی پارلر وغیرہ کی زد میں ہے، جن کو چھوڑے اور توبہ کیے بغیر دنیا وآخرت کی فلاح اور کامیابی ملنا مشکل ہے اور یہی پیسہ اگر قومی اور رفاہی مفادات پر خرچ کیا جائے تو بہت جلد ترقی حاصل کی جاسکتی ہے۔'' (ذوالحجہ اور قربانی کے مسائل واحکام، ص: ۱۶۷)

ذبح کرنے پر ایک عامیانہ اعتراض اور اس پر حضرت تھانویؒ کا حکیمانہ جواب

منکرین اور ملحدین کی طرف سے ایک اعتراض یہ بھی سامنے آتا ہے کہ زندہ جانوروں کے گلے پر چھری پھیر دینا بھی عقلِ سلیم کے خلاف ہے، یہ فعل مسلمانوں کی بے رحمی پر دلالت کرتا ہے، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے، اور ذبحِ حیوان رحم کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہوکر مرنا بہتر ہے، کیوں کہ خود مرنے میں قتل وذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کر دیا جایا کرے، تاکہ آسانی سے مرجایا کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یأس پہلے ذبح کرنا تو دیدہ دانستہ قتل کرنا ہے اور حالتِ یأس پتہ نہیں چل سکتی، کیونکہ بعض لوگ ایسی بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہوگئے تھے، پھر اچھے ہوگئے۔ اور شبہ حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یأس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کا تو اِبقاء (باقی رکھنا) مقصود ہے، کیونکہ خلقِ عالم سے وہی مقصود ہے، اس لیے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا، بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا، کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے، اس لیے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی، ورنہ بہت سے لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیئے جائیں گے، جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یأس کی حالت میں تھا۔ اور جانور کا اِبقاء مقصود نہیں، اس لیے اس کے ذبح کی جازت اس بنا پر دے دی گئی کہ ذبح ہوجانے میں ان کو راحت ہے اور ذبح ہوجانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے، جس کا اِبقاء مقصود ہے، اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہوکر اس کے گوشت میں سمّیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لیے مضر ہوگا، تو اِبقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص، جہاد میں چونکہ افناءِ بعض افراد بغرضِ اِبقاء جمیع الناس متیقن ہے، اس لیے وہاں قتل انسانی کی اجازت دی گئی، مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتیٰ الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے، یعنی: قصاص میں جو کہ قتلِ اختیاری ہے، تلوار سے۔ اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔'' (اشرف الجواب، انیسواں اعتراض: ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب، ص: ۸۶-۸۷، مکتبہ عمر فاروق)

قربانی کی حقیقت کیا ہے؟

اگر قربانی کی حقیقت پر نظر ہو تو بھی یہ وسوسہ پیدا نہیں ہوسکتا، قربانی تو یادگار ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنا بیٹا ذبح کرو، حالانکہ! دوسری طرف خود قرآن کا اعلان ہے کہ قتل کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے، نیز! بچوں کو تو جہاد کی حالت میں بھی قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، الغرض عقل کبھی بچے اور بالخصوص اپنے معصوم بچے کے قتل کو تسلیم نہیں کرسکتی، لیکن قربان جائیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر کہ انہوں نے اللہ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! جو بچہ مجھے برسہابرس دعائیں مانگنے کے بعد ملا، آخر اس کا قصور کیا ہے؟! اور اگر قصور ہے بھی تو اس کو مارنے سے کیا حاصل ہوگا؟! نہیں، اس لیے کہ جہاں اور جس کام میں اللہ کا حکم آجاتا ہے وہاں چوں چرا کی گنجائش نہیں رہتی، چاہے نفع نظر آئے یا نقصان۔

دوسری طرف قربانی کے جانور پر آنے والے اخراجات کا جائزہ لیجیے! آج کے اس مہنگائی کے دور میں بڑے جانور میں حصہ لینے کے لیے آٹھ یا نو ہزار روپے کافی ہیں اور اگر چھوٹا جانور لینا چاہیں تو بارہ سے پندرہ ہزار روپے میں کام چل جاتا ہے۔ اس جائزے کے بعد سوچئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں حکم ہو کہ تمہیں اختیار ہے کہ تم اپنا بیٹا قربانی کے لیے ذبح کرو، یا اس کی بجائے (بارہ سے پندرہ ہزار روپے کا) جانور ذبح کرو، تو بتلایئے کہ کون کس کو ترجیح دے گا؟ یقیناً بیٹے کے ذبح کے مقابلہ میں ہر عقل مند جانور ذبح کرنے کو ترجیح دے گا۔ اب ایک نظر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی ڈالیے کہ جب ان کو بیٹا ذبح کرنے کا حکم ملا (اور حکم بھی صراحۃً نہیں ملا، بلکہ خواب میں اشارۃً بتلایا گیا) تو انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی رُک کر یہ نہ پوچھا کہ یاباری عزوجل! اس میں میرے لیے کیا نفع ہے اور کیا نقصان؟! اور ایک ہم ہیں کہ معمولی سا جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا اور ہم پوچھتے پھرتے ہیں کہ اس میں میرا کیا نفع ہے؟! اس کے بجائے یہ ہوجائے، وہ ہوجائے، وغیرہ، تو یہ قربانی کی روح کے خلاف ہے، یہ سوال کرنے والا درحقیقت قربانی کی حقیقت سے ہی ناواقف ہے، قربانی کے ذریعے تو یہ جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے کہ جب اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے اللہ کے حکم کی پیروی کریں، اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کریں، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل میں اشارہ کیا ہے کہ "**فَلَمَّا أَسْلَمَا**" جب انہوں نے سر تسلیم خم کردیا۔۔۔۔ الخ۔

تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قربانی محض رسم یا دل لگی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعے ایک ذہنیت دینا مقصود ہے، جسے فلسفۂ قربانی کا نام دیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ جب اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے اللہ کے حکم کی پیروی کریں، اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کریں سو ضرورت ہے کہ منکرینِ قربانی، ملحدین اور مستشرکین وکفار کے اس زہریلے پروپیگنڈے کے مقابلے میں اہلِ اسلام پُرزور طریقے سے اس حکم پر عمل پیرا ہوں، اسی میں اہلِ اسلام کی خیر وبقا کا راز اور دینِ اسلام کی حفاظت مضمر ہے۔ **أللّٰھم وفقنا لما تحب وترضٰی۔**

راہیں دوزخ کی، آرزو جنت کی

مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی

انسانی زندگی کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ انسان کہاں جارہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ دنیا کی یہ مختصر زندگی دراصل ایک امتحان گاہ ہے جس میں ہر انسان کو اپنے اعمال کے ذریعے یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اپنے رب کی رضا کا طالب ہے یا اپنی خواہشات کا غلام۔ قرآن کریم بار بار انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی ایک عارضی پڑاؤ ہے اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے: ''وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ'' (العنکبوت. 64) ترجمہ: ''اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، کاش لوگ جان لیتے''۔

لیکن انسان کی ایک عجیب نفسیات ہے کہ وہ بسا اوقات اپنے اعمال اور اپنے دعوؤں کے درمیان شدید تضاد کا شکار ہوجاتا ہے۔ زبان پر نیکی کے دعوے ہوتے ہیں، دل میں جنت کی آرزو ہوتی ہے، لیکن زندگی کے عملی نقشے میں گناہوں، غفلتوں اور خود فریبیوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ یہی تضاد انسان کو دھوکے میں مبتلا رکھتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ وہ نیک ہے، حالانکہ اس کے اعمال اس کے دعوؤں کی تردید کررہے ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت ایک شاعر نے نہایت بلیغ انداز میں بیان کی ہے:

دوزخ کے انتظام میں الجھا ہے رات دن
دعویٰ یہ کررہا ہے کہ جنت میں جائے گا

یہ شعر دراصل انسانی خود فریبی کی ایک گہری تصویر ہے۔ انسان ایسے کاموں میں مشغول ہے جو اسے جہنم کے قریب لے جارہے ہیں، مگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جنت کا امیدوار ہے۔ اس شعر میں صرف طنز نہیں بلکہ ایک گہری تنبیہ بھی پوشیدہ ہے کہ اگر انسان نے اپنی زندگی کا محاسبہ نہ کیا تو وہ اپنے اعمال کے انجام سے بے خبر رہ کر ایک خطرناک دھوکے میں مبتلا ہوجائے گا۔ قرآن مجید نے اسی کیفیت کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

''قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ، الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا'' (الکھف:103-104)

ترجمہ: ''کہہ دیجئے کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں، وہ لوگ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر

رہے ہیں''۔

یہ آیت انسان کی اسی خودفریبی کو بیان کرتی ہے۔بعض لوگ اپنی زندگی میں ایسے راستوں پر چل رہے ہوتے ہیں جو انہیں تباہی کی طرف لے جارہے ہوتے ہیں،مگر وہ اپنے آپ کو کامیاب سمجھ رہے ہوتے ہیں۔یہی وہ کیفیت ہے جس پر ہر انسان کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

اسلام انسان کو محض دعوؤں کی بنیاد پر کامیاب قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے عمل کی بنیاد ضروری ہے۔ایمان اور عمل صالح اسلام کی نظر میں لازم وملزوم ہیں۔قرآن کریم میں بار بار''الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ'' کا ذکر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ صرف ایمان کا دعویٰ کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ صالح اعمال کا ہونا بھی ضروری ہے۔اگر انسان کے اعمال اس کے ایمان کی تائید نہ کریں تو اس کا ایمان محض ایک دعویٰ رہ جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انسان کو اس خطرناک خودفریبی سے بچانے کے لئے بار بار تنبیہ فرمائی۔ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللهِ الْأَمَانِيّ''ترجمہ:''عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے،اور نادان وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے اور اللہ سے محض امیدیں باندھتا رہے''۔

یہ حدیث دراصل اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ صرف امیدیں اور دعوے انسان کو کامیاب نہیں بنا سکتے۔ اگر انسان اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے اور نیک اعمال سے غفلت برتے تو اس کی امیدیں محض فریب اور ریت کا ڈھیر ثابت ہوں گی۔

انسانی تاریخ میں قومیں اور افراد اسی وقت تباہی کے گڑھے میں گرتے ہیں جب ان کے دعوے اور ان کے اعمال کے درمیان فاصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔جب اخلاقیات صرف زبان تک محدود رہ جائیں اور عملی زندگی میں ان کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو معاشرہ زوال کا شکار ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایمان اور عمل کے درمیان ہم آہنگی کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان بسا اوقات گناہوں کے ماحول میں زندگی گزارتا ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو نیک سمجھتا ہے۔وہ حرام کمائی میں مبتلا ہوتا ہے،ظلم اور ناانصافی کا مرتکب ہوتا ہے،لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہے،مگر اس کے باوجود اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ جنت کا مستحق ہے۔یہ وہی کیفیت ہے جسے قرآن نے غُرُور یعنی دھوکے کا نام دیا ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللهِ الْغَرُورُ''(فاطر:5)

ترجمہ:''اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے،لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ کوئی دھوکے باز

تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں ڈالے۔

یہ آیت انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دنیا کی چمک دمک اور جھوٹی امیدیں انسان کو حقیقت سے غافل کر دیتی ہیں۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ قابل معافی ہے اور آخر کار اسے جنت مل ہی جائے گی۔ حالانکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا کا مستحق ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور حدیث میں فرمایا:

''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ'' (مسلم)

ترجمہ: ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا''۔

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جنت صرف دعوؤں سے نہیں بلکہ پاکیزہ دل اور صالح اعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر انسان کے دل میں تکبر، حسد، بغض اور دنیا پرستی موجود ہو تو اس کا جنت کا دعویٰ بے بنیاد ہوگا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ'' (مسلم)

ترجمہ: ''جسے اس کے اعمال نے پیچھے چھوڑ دیا، اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا''۔

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ کے نزدیک اصل معیار عمل ہے، نہ کہ دعویٰ، نہ حسب و نسب، نہ ظاہری حیثیت۔ اگر اعمال درست نہ ہوں تو انسان کے تمام دعوے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

انسان کی اصلاح کا سب سے مؤثر ذریعہ محاسبۂ نفس ہے۔ جب انسان روزانہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اس کی زندگی کس سمت جا رہی ہے تو اسے اپنی کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے: ''حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا'' ترجمہ: ''اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے''۔ یہ قول دراصل انسان کو اسی خطرناک خود فریبی سے بچانے کی پرزور دعوت ہے۔ اگر انسان دنیا میں اپنے اعمال کا محاسبہ کر لے تو آخرت میں اسے شرمندگی سے بچ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت کا راستہ خواہشات اور دعوؤں سے نہیں بلکہ مجاہدہ اور اطاعت سے کھلتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى، فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى'' (النازعات: 40-41) ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے''۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جنت ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی خواہشات پر قابو پاتے ہیں اور اللہ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر انسان خواہشات کی غلامی میں مبتلا ہو جائے اور پھر بھی جنت کا دعویٰ کرے تو یہ خود فریبی کے سوا کچھ

نہیں۔اسلام انسان کو امید اور خوف کے درمیان زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ ایسا خوف کہ انسان مایوسی کا شکار ہوجائے اور نہ ایسی امید کہ انسان بے فکر ہوجائے۔مومن کی زندگی میں امید بھی ہوتی ہے اور خوف بھی۔یہی توازن اسے سیدھے راستے پر قائم رکھتا ہے۔

اگر انسان واقعی جنت کا طالب ہے تو اسے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقہ، حسن اخلاق، عدل وانصاف، امانت داری، اور حقوق العباد کی ادائیگی وہ اعمال ہیں جو انسان کو جنت کے قریب لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ظلم، خیانت، حرام کمائی، جھوٹ، غیبت اور تکبر وہ اعمال ہیں جو انسان کو جہنم کے قریب لے جاتے ہیں۔

لہٰذا عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو ایسے اعمال سے بھر دے جو اسے جنت کی طرف لے جائیں۔اگر انسان جہنم کے راستوں پر چلتے ہوئے جنت کی امید رکھے تو یہ امید حقیقت میں ایک دھوکہ بن جاتی ہے۔

ہر انسان کو ایک دن اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔اس دن نہ کوئی عذر کام آئے گا اور نہ کوئی جھوٹا دعویٰ۔قرآن کریم اس منظر کو یوں بیان کرتا ہے:

''فَمَن یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَرَہُ، وَمَن یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہُ''(الزلزال:7-8)

ترجمہ:''پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا''۔

معلوم ہوا کہ آخرت میں ہر عمل کا حساب ہوگا۔اس دن انسان کے دعوے نہیں بلکہ اس کے اعمال اس کے انجام کا فیصلہ کریں گے۔اسی لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس دھوکے سے بچائے جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔ اگر انسان واقعی جنت کا امیدوار ہے تو اسے اپنی زندگی کو ایسے اعمال سے آراستہ کرنا ہوگا جو جنت کے دروازے کھولتے ہیں۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ انسان پوری زندگی خود فریبی میں گزار دے اور جب حقیقت سامنے آئے تو اس کے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

ہماری کامیابی کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے دعوؤں کو اپنے اعمال کے مطابق بنالیں۔جب زبان پر ایمان ہو اور زندگی میں عمل صالح ہو، جب دل میں اللہ کا خوف ہو اور کردار میں اس کی اطاعت ہو، تبھی انسان حقیقی معنوں میں جنت کا امیدوار بن سکتا ہے۔

اگر انسان اس حقیقت کو سمجھ لے تو زندگی بدل سکتی ہے۔وہ ہر دن اپنے اعمال کا جائزہ لے گا، اپنی غلطیوں سے توبہ کرے گا اور اپنے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا۔یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو آخرت کی کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

تیری نسبت ابراہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے

عمر فاروق ندوی فتحپوری

شاعر مشرق علامہ اقبال کے شعر کا یہ مصرعہ محض ایک مجموعہ الفاظ، ایک شعری بندش نہیں ہے، بلکہ یہ مصرعہ اپنے اندر ایک گہرا پیغام اور عظیم ذمہ داری کا احساس سموئے ہوئے ہے۔ یہ مسلمان کو اس کی حقیقی پہچان، اس کے مقصدِ حیات اور اس کے کردار کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔

اس مصرعہ کا پہلا جز ''ابراہیمی نسبت''، محض ایک لفظی تعلق نہیں بلکہ ایک فکری، روحانی اور عملی وابستگی ہے، جو مسلمان کو بلند کردار، مضبوط ایمان اور اصلاحِ عالم کی طرف لے جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات اسلام میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ آپؑ کو ''ابوالانبیاء'' کہا جاتا ہے کیونکہ آپؑ کی نسل سے بے شمار انبیاء تشریف لائے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ''امّت'' قرار دیا، یعنی ایک ایسی شخصیت جو اپنی ذات میں ایک مکمل امت کے برابر ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؑ نے زندگی کے ہر میدان میں حق کا ساتھ دیا، باطل کا مقابلہ کیا اور اللہ کی رضا کو ہر چیز پر مقدم رکھا۔

اس ابراہیمی نسبت کا پہلا تقاضا ''توحیدِ خالص'' ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے گھر اور معاشرے میں پھیلے ہوئے شرک کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے بتوں کو توڑا، ستاروں، چاند اور سورج کی پرستش کرنے والوں کو دلائل کے ذریعے سمجھایا اور اعلان کیا کہ ''میں ان سب سے بیزار ہوں، میں تو اسی ایک اللہ کی عبادت کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔'' یہ پیغام آج بھی اتنا ہی اہم ہے، کیونکہ انسان مختلف شکلوں میں شرک اور دنیا پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ابراہیمی نسبت رکھنے والا شخص ہمیشہ اپنے ایمان کو خالص رکھتا ہے اور ہر طرح کے باطل نظریات سے دور رہتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو ''قربانی اور اطاعت'' ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اللہ کے حکم پر وطن چھوڑنا، اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جانا، اور بیابان میں اپنے اہل وعیال کو چھوڑ دینا یہ سب ایسے امتحانات تھے جن میں آپؑ نے کامل اطاعت اور تسلیم ورضا کا مظاہرہ کیا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک انسان کو عظیم بناتا ہے۔ آج کے دور میں اگرچہ اس نوعیت کے امتحانات نہیں، مگر آج بھی ایک مسلم ایک مومن کی زندگی کا ایمانی تقاضہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات، وقت، مال اور آرام کو اللہ کی رضا کے لیے قربان کرنا پڑتا ہے۔

تیسرا پہلو ''ثابت قدمی اور استقامت'' ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب حق کی دعوت دینے پر آگ میں ڈالا گیا تو آپؑ

نے خوف یا کمزوری کا اظہار نہیں کیا بلکہ پورے یقین کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو آپؑ کے لیے ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو شخص حق کے راستے پر ثابت قدم رہتا ہے، اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے، چاہے حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔

اس مصرعہ کے دوسرے جز یعنی ''معمارِ جہاں تو ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اسے یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ دنیا کو بہتر بنائے، عدل وانصاف قائم کرے، علم کو فروغ دے اور انسانیت کی خدمت کرے۔ ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ صرف عبادات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح اور تعمیر کا کام کرتا ہے، اور اپنے کردار وعمل سے یہ باور کراتا رہتا ہے کہ وہ ''معمار جہاں'' ہے، تعمیر جہاں اس کی زندگی کا عنوان ہے، مگر معمارِ جہاں بننے کے لیے چند بنیادی اوصاف ضروری ہیں:

*اعلیٰ اخلاق: سچائی، دیانت، صبر، برداشت اور حسنِ سلوک ایک معمارِ جہاں کی پہچان ہیں۔

*علم وشعور: جہالت کبھی تعمیری کردار ادا نہیں کرسکتی، اس سے ہمیشہ تخریب کاری ہی کا عمل انجام دیا سکتا ہے۔ علم ہی وہ روشنی ہے جس سے انسان خود بھی سنورتا ہے اور دوسروں کو بھی بناتا اور سنوارتا ہے۔

*عدل وانصاف: ایک صالح معاشرہ اور صحتمند سماج اسی وقت بنتا ہے جب اس میں عدل وانصاف کا قیام ہو اور ظلم وجور کا خاتمہ ہو۔

*خدمتِ خلق: انسانیت کی خدمت ہی اصل کامیابی ہے،'' واما ما ینفع الناس فیمکث في الارض ''(القرآن) اور ارشاد نبوی ہے:'' خیر الناس من ینفع الناس ''۔ پھر چاہے وہ تعلیم کے ذریعے ہو، یا رفاہی سرگرمیوں کے ذریعے یا رہنمائی کے ذریعے۔

آج کا دور چیلنجز سے بھرا ہوا ہے۔ اخلاقی انارکی، ناانصافی، بے ایمانی اور مادہ پرستی نے معاشرے کو کمزور کردیا ہے۔ ایسے حالات میں ''ابراہیمی نسبت'' رکھنے والے افراد کی اشد ضرورت ہے جو اپنے کردار اور عمل سے دنیا کو سنوار سکیں۔ ہمیں اپنے اندر وہی جذبہ پیدا کرنا ہوگا جو حضرت ابراہیمؑ اور آل ابراہیم میں تھا یعنی حق کے لیے کھڑا ہونا، باطل سے ٹکرانا اور ہر حال میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھنا۔ الغرض حضرت علامہ اقبال کا یہ مصرعہ:

''تیری نسبت ابراہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے''

ایک دعوت ہے، ایک پکار ہے، جو ہر انسان کو، ہر قلب سلیم رکھنے والے کو، اس کے عظیم مقصد کی طرف بلاتی ہے۔ اگر ہم اس نسبت کو سمجھ لیں اور اس کے تقاضوں کو اپنی زندگی میں نافذ کرلیں تو ہم نہ صرف ایک صالح انسان بن سکتے ہیں، بلکہ ایک بہترین معاشرہ اور روشن دنیا کی تعمیر کا فریضہ بھی بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اور یہی حقیقی کامیابی اور اصل فلاح ہے۔

ہیٹ ویو سے بچاؤ ایک دینی اور شرعی تقاضا

مولانا ابوبکر حنفی شیخوپوری

موسمِ گرما، قدرت کی نشانی: اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی تغیر ہے، کبھی فضا میں خنکی بڑھ جانے سے موسم سرد ہو جاتا ہے تو کبھی لو چلنے سے حدت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی بہاروں کی رت درختوں کو سرسبز پوشاک سے آراستہ کرتی ہے، تو کبھی خزائیں ڈیرے ڈال کر اُن سے یہ رونقیں چھین لیتی ہیں۔ یہ سب خالقِ حقیقی کی خوبصورت تخلیق کے دلفریب مناظر اور اس کی کمالِ صنعت کے مظاہر ہیں، جو یہ اعلان کر رہے ہیں کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو نظامِ کائنات کی منظم اور گردشِ ایام کی محرک ہے۔

شریعت اور ہیٹ ویو سے بچاؤ: اس وقت موسمِ گرما ہم پر سایہ افگن ہے، سورج کی حدت سے فضا میں ردوبدل کی صدیوں پرانی فطری اور تکوینی روایت جاری ہے۔ اس موسم میں خود کو آفتاب کی تپش سے بچانا، گھر سے باہر سر ڈھانپ کر نکلنا اور ہیٹ ویو سے بچاؤ کے تمام تر ممکنہ اقدامات کرنا صرف انسان کی طبعی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ایک اہم دینی تقاضا اور شرعی حکم ہے۔ قرآن وسنت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ گرمی کی تپش سے بچنے کے لیے کسی درخت یا عمارت کے سائے میں بیٹھنا اور آرام کرنا چاہیے، بلاوجہ دھوپ میں کھڑا ہونا ایک نامناسب طریقہ اور خود کو سزا دینے کے مترادف ہے۔

قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب وہ مصر سے سفر کرتے ہوئے مدین پہنچے تو کنویں کے قریب موجود ایک درخت کے سائے میں پناہ لی، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''ثُمَّ تَوَلّٰی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ '' (القصص: ۲۴) کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سائے کی طرف پناہ پکڑی تو عرض کیا: اے میرے رب! تو نے جو مجھے یہاں (مدین میں) اُتارا ہے، میں خیر کا طلبگار ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا کہ دورانِ سفر کچھ دیر کے لیے رُکنا پڑتا تو سائے والی جگہ کا انتخاب فرماتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوپہر کے وقت ہمارے گھر تشریف لائے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت یہ تھی: ''مقنعاً رأسہ'' کہ اپنے سر مبارک کو کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا تَظْلِمُوْا فِیْھِنَّ اَنْفُسَکُمْ'' یعنی ''ان (مخصوص ماہ) میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔'' (سورۂ توبہ) اس آیت کی رو سے جہاں اپنی جان کے اوپر ہر قسم کی زیادتی حرام قرار دی گئی ہے، وہیں اس کے عموم میں گرمی کی حرارت سے خود کو اذیت میں مبتلا کرنا بھی شامل ہوگا۔ حضرت قیس بن حازم رضی اللہ عنہ اپنے والد کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ وہ دھوپ میں بیٹھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھ لیا تو فرمایا: سائے میں آجاؤ۔

ہیٹ ویو اور شجر کاری: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے درخت کے نیچے پیشاب پاخانہ کرنے سے منع فرمایا ہے جہاں

لوگ سایہ حاصل کرنے لیے رکتے ہوں، اور اس غیر مہذب عمل کو موجبِ لعنت قرار دیا ہے۔ (مسند احمدؒ) اسی طرح جو کام ہیٹ ویو کے تدارک کا سبب بنے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، چنانچہ درخت ہیٹ ویو میں کمی کا باعث بنتے ہیں، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درخت لگانے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس مسلمان نے کوئی درخت لگایا اور اس کا پھل آدمیوں اور جانوروں نے کھایا تو اس درخت لگانے والے کے لیے صدقے کا ثواب ہے۔ (مجمع الزوائد) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے: ''سات اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب آدمی کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے، حالانکہ وہ قبر میں ہوتا ہے، ان میں سے ایک درخت لگانا ہے۔'' (صحیح الجامع الصغیر)

ہیٹ ویو اور ٹھنڈے پانی کا استعمال: ہیٹ ویو کے مضر اثرات سے بچنے کا ایک اہم ذریعہ ٹھنڈے اور صاف پانی کا استعمال ہے۔ گرمی سے بے حال لوگوں کے ٹھنڈے پانی کا انتظام کرنا خواہ وہ کولر بھر کر رکھنے کی صورت میں ہو، یا پانی کی ٹینکی لگوانے کی صورت میں ہو، انتہائی مبارک عمل اور خدمتِ انسانیت کی اعلیٰ مثال ہے، یہ وہ صدقہ جاریہ ہے جس کا ثواب مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلائے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے میوے کھلائے گا، جو کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلائے گا اللہ اس کو نہایت نفیس شرابِ طہور پلائے گا، جس پر غیبی مہر لگی ہوگی اور جو کسی ننگے مسلمان کو کپڑا پہنائے گا اللہ اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔'' (سنن ابی داؤد)

نمازِ ظہر میں تاخیر: گرمی کے موسم میں دھوپ سے بچنا کتنا ضروری ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ نماز جیسی عبادت جسے اول وقت میں پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس کو مؤخر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں نمازِ ظہر کو زوال کے فوراً بعد ادا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اتنی تاخیر سے پڑھنا چاہیے کہ گرمی کی حدت میں قدرے کمی واقع ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب سخت گرمی پڑے تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو''۔ آگے اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا: ''گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے آتی ہے (اور جہنم نے اس لیے سانس لیا کہ ایک دفعہ) آگ نے اپنے رب سے شکایت کرتے ہوئے کہا: اے میرے رب! (گھٹن کی وجہ سے) میرا بعض حصہ بعض حصے کو کھا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت دی، ایک سانس سردیوں میں اور ایک سانس گرمیوں میں۔'' (بخاری مسلم)

جانوروں کو ہیٹ ویو سے بچانا: شریعتِ مطہرہ میں جانوروں کے حقوق کا خیال رکھنے پر بڑا زور دیا گیا ہے، لہٰذا جس طرح ہم اپنی ذات کے لیے گرمی سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہیں، اسی طرح جانوروں کو بھی سائے میں باندھنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے، ان جانوروں کا یہ حق ہے کہ اگر مالک ان سے کام لیتا ہے تو ان کی بھوک پیاس اور دھوپ چھاؤں کا بھی خیال کرے، ورنہ قیامت کے دن جانوروں کے بارے میں کی گئی حق تلفی پر بھی جوابدہ ہونا پڑے گا۔

فقہ وفتاوی

مفتی محمد ریحان گودھروی

سوال.....: کیا دورانِ طواف عمرہ اور حج کے احرام میں دھوپ اور گرمی سے بچنے کے لئے سر پر چھتری پہن سکتے ہیں وہ چھتری جو کہ ربڑ اور لاسٹک والی ہوتی ہے اور چھتری سر سے دس انچ اوپر ہوتی ہے؟۔

جواب.....: اگر یہ چھتری ٹوپی کی طرح سر سے لگی نہیں ہوتی بلکہ سر سے اوپر کچھ فاصلہ پر ہوتی ہے، جیسا کہ سوال میں ہے تو حالت احرام میں ایسی چھتری پہننا جائز ہے، بشرطیکہ اس چھتری کی لاسٹک اتنی چوڑی نہ ہو جو سر کے چوتھائی حصے کو گھیر لے، ورنہ اس کو پہننا ناجائز ہوگا۔ ''**كما في الهندية: ولو حمل المحرم شيئا على رأسه فإن كان من جنس ما لا يغطى به الرأس كالطست والأجانة..... ونحوها فلا شيء عليه، وإن كان من جنس ما يغطى به الرأس من الثياب فعليه الجزاء كذا في المحيط.** اھ (242/1، حج کے ضروری مسائل: ۳۶)

سوال.....: مسجد حرام میں بھیڑ ہونے کی وجہ سے اسپرے بوتل سے وضو کرنے کا حکم کیا ہے۔؟

جواب.....: وضوء نماز کے لیے ضروری ہے، اگر وضو ہی صحیح نہیں ہوا تو نماز بھی درست نہیں ہوگی، اسی لیے فقہاء کرام نے وضو کے احکام بہت تفصیل سے ذکر فرمائے ہیں، جس میں اسباغ الوضوء بھی ہے، حدیث پاک میں اسباغ الوضوء (یعنی اچھی طرح وضوء کرنا، سنن ومستحبات کی رعایت کرنا، اور عضو کے ہر ہر حصے تک پانی بہانے کا اہتمام کرنا) کی بہت تاکید وارد ہوئی ہیں، نیز وضوء کرتے وقت کوئی عضو خشک رہ جائے اس پر وعید وارد ہوئی ہے، جبکہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند جواب نمبر ۸۰ میں ہے کہ: ''اسپرے بوتل سے وضوء کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں اس کا قوی اندیشہ ہے کہ عضو کے ہر ہر جزء پر غسل کا سیلان نہ ہو، یا کم از کم اس میں شک وشبہ پیدا ہو'' لہذا اسپرے بوتل سے وضوء کرنے کے بجائے مکمل طور پر وضوء کا اہتمام کرنا چاہیے اور اس میں کچھ مشقت ہو تو برداشت کرنا چاہیے۔ نوٹ: اگر کوئی شرعا معذور ہو تو اسپرے بوتل سے وضوء کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اعضاء وضوء سے واضح طور پر قطرات ٹپکیں۔

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ألا أدلكم على ما يمحو الله به الخطايا ويرفع به الدرجات؟ قالوا: بلى يا رسول الله، قال: إسباغ الوضوء على المكاره، وكثرة الخطا إلى المساجد وانتظار الصلاة بعد الصلاة، فذلكم الرباط (ترمذی، رقم: ۵۱، باب فی اسباغ الوضوء)

قوله: إسباغ الوضوء: أي: إكماله وإتمامه باستيعاب أعضائه بالماء وتكرار الغسل ثلاثا. وفي حاشية الجامع للترمذي المطبوع في الهند: الإسباغ على ثلاثة أنواع: فرض: وهو استيعاب المحل مرة. وسنة: وهو الغسل ثلاثا. ومستحب: وهو الإطالة مع التثليث. كذا سمعته من أستاذنا المرحوم

مولانا محمد إسحاق. (انتهى). وقوله: على المكاره، جمع مكره، بفتح الميم ما يكره الإنسان، ويشق عليه، والكره بالضم والفتح المشقة. قال الأبي: وهي تكون لشدة البرد، وألم الجسم، وفوت المحبوب، وتكلف طلب الماء...... إلخ. (كفاية المغتذي: ١/ ٢٦١، مؤسسه علميه، ڈھاکہ۔ معارف السنن: ١/ ٢٠٠، اشرفیه، دیوبند۔ العرف الذكي: ١/ ٢٠٢۔ دار الافتاء دار العلوم دیوبند)

سوال......: ذبح کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

جواب......: ذبح کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ قربانی کی نیت کرنے کے بعد جانور کو قبلہ رولٹا کر یہ دعا پڑھیں: ”إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِين“۔ پھر تیز چھری سے: ”بِسْمِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کہہ کر حلق اور لبہ کے درمیان ذبح کرے، گردن کو پورا کاٹ کر الگ نہ کرے، ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھیں: ”اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّ خَلِيْلِكَ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمَا الصَّلاَةُ وَ السَّلَام“۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٤/ ١٩٣، جواہر الفقہ)

سوال......: کیا مشترک قربانی میں گوشت تقسیم کرنا ضروری ہے؟ اور اگر کوئی تقسیم کرنا چاہے تو کس طرح تقسیم کرے؟۔

جواب......: گوشت تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے، البتہ اگر تقسیم کرنا چاہیں، تو اندازہ اور تخمینہ سے تقسیم نہ کریں، بلکہ وزن کر کے تقسیم کریں، اور اگر تخمینہ اور اندازہ سے تقسیم کریں تو ساتھ میں سر، پائے، اور کھال وغیرہ ملا دے، تاکہ ربو (سود) لازم نہ آئے: ”ويقسم اللحم وزنا لا جزافا، إلا إذا ضم معه من الأكارع والجلد صرفا للجنس الخلاف جنسه (در مختار) (قوله ويقسم اللحم) انظر هل هذه القسمة متعينة أو لا؟ حتى لو اشترى لنفسه ولزوجته وأولاده الكبار بدنة ولم يقسموها تجزيهم أو لا ؟ والظاهر أنها لا تشترط، لأن المقصود منها الإراقة وقد حصلت . . وحاصله أن المراد بيان شرط القسمة إن فعلت، لا أنها شرط إلخ۔“ (شامي ٥/٢٢٣، محمود الفتاوى: ٧/٤٥٥)

سوال......: آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب......: آدھی آستین والی شرٹ یا ٹی شرٹ میں نماز پڑھنا کف ثوب کی وجہ سے مکروہ ہے، اسی طرح پوری آستین والا کپڑا (چاہے شرٹ ہو یا کرتا) اس طرح سمیٹنا کہ کہنیاں کھلی رہ جائیں مکروہ ہے، لہذا مکمل آستین والے کپڑے میں نماز پڑھنا چاہیے: ”ولو صلى رافعا كميه إلى المرفقين كره. كذا في فتاوى قاضي خان. (فتاویٰ عالمگیری: ١/ ١٠٦، دار الفکر، بیروت)

الدر مع الرد میں ہے: (و) كره (كفه) أي رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل (وعبثه به) أي بثوبه (وبجسده) للنهي إلا لحاجة ولا بأس به خارج صلاة. (قوله كمشمر كم أو ذيل) أي كما لو دخل في الصلاة وهو مشمر كمه أو ذيله، وأشار بذلك إلى أن الكراهة لا تختص بالكف وهو في الصلاة.“ (كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ج: 1 ص: 640 ط: سعيد، فتاوی عثمانی ١/٤٢٤، مکتبہ معارف القرآن کراچی)

افسانہ

قصہ چہار درویش

قسط:۱۱ از: میر امن دہلوی

(سیر دوسرے درویش کی:)

جب دوسرے درویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وہ چار زانو ہو بیٹھا اور بولا۔ اے یارو!

اس فقیر کا ٹک ماجرا سنو!

میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو!

جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم

ہے گا ہمارا درد نپت لا دوا سنو!

اے دلق پوش! یہ عاجز بادشاہ فارس کے ملک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصفہان نصف جہاں مشہور ہے۔ ہفت اقلیم میں اس اقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں کہ وہاں کا ستارہ آفتاب اور وہ ساتوں کواکب میں نیر اعظم ہے۔ آب و ہوا وہاں کی خوشی اور لوگ روشن طبع اور صاحب سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے، جو بادشاہ اس ملک کے تھے لڑکپن سے قاعدے اور قانون سلطنت کی تربیت کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا ہر ایک علم اور کسب کے چن کر میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے تو تعلیم کامل ہر نوع کی پا کر قابل ہوں۔ خدا کے فضل سے چودہ برس کے سن و سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول نشست و برخاست پسندیدہ اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے سب حاصل کیا اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں قصے ہر ایک ملک کے اور احوال اوالعزم بادشاہوں اور نام آوروں کا سنا کروں۔

ایک روز ایک مصاحب دانا نے کہ خوب تواریخ داں اور جہاں دیدہ تھا، مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ ان کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک زبانوں پر بخوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا اگر تھوڑا سا احوال اس کا مفصل بیان کرو تو میں بھی سنوں اور اس پر عمل کروں۔ تب وہ شخص حاتم طائی کا ماجرا اس طرح سے کہنے لگا۔

قصہ حاتم طائی کا:

حاتم طائی کے وقت میں ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا۔ اس کو حاتم کے ساتھ بہ سبب نام آوری کے دشمنی مکال ہوئی۔ بہت سا لشکر فوج جمع کر کر لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا، یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے۔ اور بڑے خوں ریزی ہوگی۔ اس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات

سوچ کر تن تنہا اپنی جان لے کر پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔

جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی، سب اسباب گھر بار حاتم کا قرق کیا اور منادی کرا دی جو کوئی حاتم کو ڈھونڈ کر پکڑ لاوے پانچ سو اشرفی بادشاہ کے سرکار سے انعام پاوے۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم کی کرنے لگے۔ اور روز ایک بوڑھا اس کی بڑھیا دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیے ہوئے لکڑیاں توڑنے کے واسطے اس غار کے پاس جہاں حاتم پوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اس جنگل سے چننے لگے، بڑھیا بولی کہ اگر ہمارے کچھ دن بھلے آتے تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا، ہم آرام سے کھاتے اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا۔ کیا ٹرٹر کرتی ہے؟ ہماری طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں، تب لون روٹی میسر آوے یا ایک روز جنگل سے باگھ لے جاوے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتم کا ہے کو آوے گا اور بادشاہ روپے دلاوے گا؟ عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی۔ یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سنیں، مروی اور مروت سے بعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے اور جان کو بچائے اور ان دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں، اور جس کی جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے۔ وہ نہیں باہر نکل آیا اور اس بوڑھے سے کہ اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں۔ میرے تئیں نوفل کے پاس لے چل۔ وہ مجھے دیکھے گا اور جو کچھ روپے دینے کا اقرار کیا ہے تجھے دیوے گا۔ میر مرد نے کہا، س ہے کہ اس صورت میں بھلائی اور بہبودی البتہ ہے، لیکن وہ کیا جانے تجھ سے سلوک کرے، اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں؟ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو طمع کی خاطر دشمنی کے حوالے کروں۔ وہ مال کتنے دن کھاؤں گا اور کب تک جیئوں گا؟ آخر مر جاؤں گا، تب خدا کو کیا جواب دوں گا۔

حاتم نے بہتیری منت کی کہ مجھے لے چل۔ میں اپنے خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ مرا جان مال کسو کے کام آوے تو بہتر ہے۔ لیکن وہ بوڑھا کسی طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاتا تو میں آپ سے آپ بادشاہ پس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کوہ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ بوڑھا ہنسا اور بولا۔ بھلائی کے بدلے برائی ملے، تو یا نصیب اس ردوبدل کے سوال جواب میں آدمی اور بھی آ پہنچے، بھیڑ لگ گئی۔ افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفل کے رو برو لے گئے تو اس نے پوچھا اس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہماری اور کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہماری نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک لن ترانی والا ٹینگ مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر کر جنگل سے پکڑ لیا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجئے اور جو قرار ہے، سو دیجئے۔ اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وہ بوڑھا چپکا ایک کونے میں لگتا ہوا سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر روتا تھا۔ (جاری)

جامعۃ السعادۃ واسعادالبنات کیرانہ

شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''جامعۃ السعادۃ'' مغربی یوپی کے مردم خیز قصبہ ''کیرانہ، شاملی'' کا ایک عظیم ومنفرد ادارہ ہے۔جس کے مقاصد میں سے قرآن وحدیث کی ترویج واشاعت کے ساتھ، ایسے باصلاحیت رجال کار تیار کرنا ہے، جو ملت اسلامیہ کی علمی، دینی اور فکری قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں اور اپنی خوابیدہ قوم کو بیدار کرسکیں۔

یہ ادارہ ۱۴۲۸ھ سے علم کی شمع جلانے اور اس کی لو کو تیز کرنے میں مصروف ہے، بچوں اور بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ، عربی، اردو اور انگریزی زبان بولنے ولکھنے کی ان کے اندر صلاحیت پیدا کرنے اور صحیح ڈھنگ سے ان کی تربیت کرنے، نیز عوام الناس میں دینی بیداری پیدا کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے اس کے خصوصی تعلیمی وتربیتی پروگرام اور انتہائی علمی ووقیع ماہ نامہ ''تحقیقات اسلامی'' کی پابندی کے ساتھ اشاعت ایسے کارنامے ہیں کہ کم ہی ادارے اس قلیل مدت میں اس منزل کو حاصل کر پاتے ہیں۔ جامعہ کی مستقل اپنی انتہائی خوبصورت ودیدہ زیب دومنزلہ عمارت ہے، جس میں تعلیمی، تربیتی اور دعوتی ۱۴ رشعبے قائم ہیں۔طلبہ کی ایک کثیر تعداد دارالاقامہ میں مقیم ہے جن کے قیام وطعام اور لباس وفوری علاج کا جامعہ میں انتظام ہے اور دیگر ہر طرح کی سہولیات انہیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملحق ہے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے نصاب کے مطابق ثانویہ اولیٰ سے عالیہ ثانیہ تک کی تعلیم کے ساتھ حفظ مع تجوید، ناظرہ قرآن کریم، دینیات اور حکومت ہند سے منظور شدہ: جامعۃ السعادۃ للدارین پبلک اسکول کے تحت درجہ آٹھ تک کی تعلیم ماہر اساتذہ کی نگرانی میں جاری ہے۔

جب کہ بچیوں کی خصوصی تعلیم وتربیت کے لئے علاحدہ سے ''جامعہ اسعادالبنات'' قائم ہے۔اس کی بھی دومنزلہ انتہائی محفوظ، خوبصورت اور ہر طرح کی سہولیات سے مزین عمارت ہے۔بچیوں کی نگرانی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے باصلاحیت عالمائیں مامور ہیں، یہ ادارہ بھی ندوۃ العلماء سے ملحق ہے۔جس میں ندوہ ہی کے نصاب ونظام کے مطابق از درجہ پرائمری تا دورہ حدیث شریف کی تعلیم جاری ہے، ساتھ ہی کمپیوٹر اور دست کاری (سلائی، کڑھائی، امور خانہ داری) بھی سکھائی جاتی ہے۔

جامعہ کی مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔مخیّر حضرات سے اپیل ہے کہ صدقات، زکوٰۃ اور عطیات کی رقوم سے جامعہ کا تعاون فرمائیں۔ **ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین**

محمد عرفان ثاقب قاسمی
محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ ضلع شاملی۔یوپی 247774
رابطہ نمبر: 9359602830 / 09319530768

Tehqiqat-e-Islami

Post No. UP/MZN- 86/2015-17 RNI No: upurd/2011/42786
Kairana, Distt. Shamli (U.P) India
E-mail: tahqiqat-eislamia@yahoo.com
Website: www.jamiakairana.com
www.shariyahacademy.com , academy2016web@gmail.com

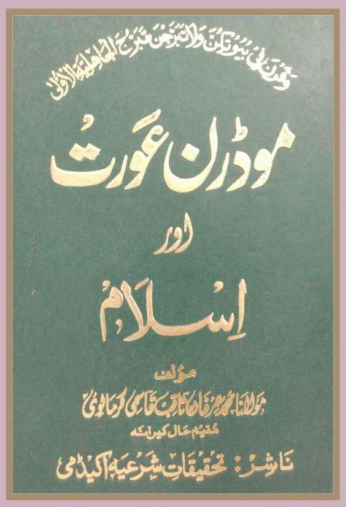

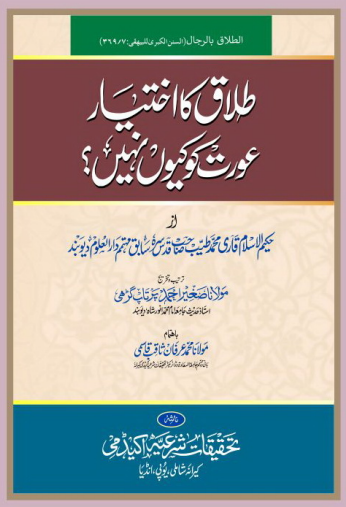

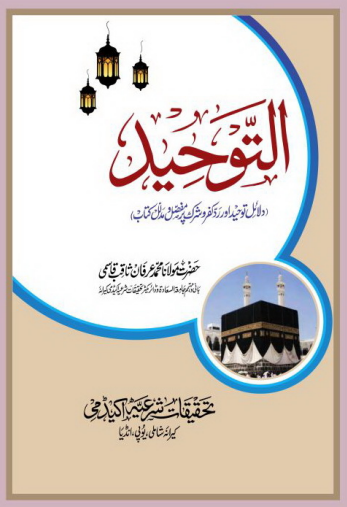

JAMIATUS SA'ADAH
Moh.Ibrahim Pura, (Aal Kalan) Shamli Road,
Kairana, Distt. Shamli U.P Pin: 247774
Mob: 09359602830, 09319530768